

MIRZA GHALIB MIRZA ASADULLAH BAIG KHAN

[www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

# دیوانِ غالب



A CLASSICAL URDU  
& PERSIAN POET  
FROM THE MUGHAL EMPIRE  
DURING BRITISH  
COLONIAL RULE  
1797 - 1869



# دیوانِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ناشر

ثناء پبلی کیشنز - کراچی

موبائل نمبر: 0300-9231954

---



## جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب	..... دیوانِ غالب
شاعر	..... مرزا اسد اللہ خاں غالب
بار اول	..... جون 2009ء
تعداد	..... گیارہ سو
کمپوزنگ	..... نثار احمد بلوچ
مارکیٹنگ	..... عمران میمن

قیمت - 300/- روپے

## اسٹاکسٹ

☆ رشید نیوز ایجنسی	..... فریئر مارکیٹ - کراچی
☆ الرحمن بک پبلیس	..... اردو بازار - کراچی
☆ طاہر سنز	..... اردو بازار - لاہور
☆ کتاب گھر	..... کمیٹی چوک - راولپنڈی
☆ کتب خانہ مقبول عام	..... جھنگ بازار - فیصل آباد
☆ فیصل بک اسٹال	..... کھارادر - کراچی





بہ مہر نامہ جو بوسہ گل پیام رہا ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا  
ہوا نہ مجھ سے بجز درد، حاصل صیاد بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا  
دل و جگر تفتِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے ولے ہنوز خیالی وصالِ خام رہا  
تکست رنگ کی لائی سحرِ شبِ سنبھل پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا  
دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا ! کہ شبِ خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

نہ پوچھ حالِ شب و روزِ ہجر کا، غالب!

خیالی زلف و رُخِ دوست صبح و شام رہا



# فہرست

.....	مرزا اسد اللہ خاں غالب
21.....	نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
22.....	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار
23.....	کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
24.....	دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
25.....	شوق، ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
26.....	دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نمر د تھا
27.....	شمارِ سچے مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
28.....	دہر میں، نقشِ وقادجہ تسلی نہ ہوا
29.....	ستایشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
32.....	محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
33.....	بزمِ شاہنشاہ میں، اشعار کا دفتر گھلا
35.....	شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا
36.....	نالہ دل میں شب اندازِ اثرِ نایاب تھا
37.....	ایک ایک قطرے کا مجھے دنیا پڑا حساب
38.....	بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
40.....	شبِ خمارِ شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا
41.....	دوست، غمخواری میں میری سچی فرماوینگے کیا
42.....	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
44.....	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!
45.....	درِ خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سانہ ہوا



- 47..... پے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارِ سالی کا
- 48..... گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
- 50..... دردِ منت کشِ دوانہ ہوا
- 51..... گلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگی جا کا
- 52..... قطرہئے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
- 53..... یک ذرہ ز میں نہیں بیکارِ باغ کا
- 54..... وہ مری چہن جہیں سے غم پنہاں سمجھا
- 55..... پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
- 56..... ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!
- 58..... تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا
- 59..... شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا
- 60..... عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
- 61..... رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف!
- 62..... ذکرِ اُس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا
- 63..... غافل بہ وہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں
- 64..... جو ر سے باز آئے، پر باز آئیں کیا!
- 65..... عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
- 67..... پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
- 69..... افسوس کہ دیداں کا کیا رزقِ فلک نے
- 70..... آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
- 71..... غیریوں کرتا ہے میری مددِ سش، اُس کے ہجر میں
- 72..... گلشن میں بندوبستِ برنگِ دگر ہے آج
- 73..... نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
- 74..... حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
- 75..... نکلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظرِ در و دیوار
- 77..... گھر جب بنا لیا ترے در پر کے بغیر



- 79..... کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار دیکھ کر
- 81..... لرزتا ہے مراد دلِ زحمتِ مہر درخشاں پر
- 82..... ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
- 84..... صفاے حیرتِ آئینہ ہے سماںِ رنگِ آخر
- 84..... جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ غریانی
- 85..... لازم تھا کہ دیکھو مرارستا کوئی دن اور
- 89..... نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
- 91..... مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
- 93..... رُخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
- 94..... زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
- 96..... آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
- 97..... ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفاے گل
- 99..... غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
- 101..... وہ فراق اور وہ وصال کہاں
- 101..... کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
- 103..... آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
- 105..... عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
- 106..... مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
- 107..... ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
- 108..... ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
- 110..... مانعِ دشتِ نور دی کوئی تدبیر نہیں
- 112..... جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
- 113..... ملتی ہے خوے یار سے نارِ الہاب میں
- 115..... کل کے لئے، کر آج نہ خستِ شراب میں
- 117..... حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
- 119..... ذکرِ میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں



- 121..... نالہ جو حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
- 124..... یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
- 125..... نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
- 126..... تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
- 127..... دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
- 128..... سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
- 131..... دیوانگی سے، دوش پہ زنتار بھی نہیں
- 133..... نہیں ہے زخم کوئی، بنجے کے درخوڑ مرے تن میں
- 134..... مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
- 135..... دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے
- 137..... غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ "یوں"
- 139..... حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
- 140..... وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
- 142..... قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
- 144..... دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو
- 145..... واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو
- 147..... تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
- 148..... گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہوا
- 150..... کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنخ فغاں کیوں ہوا
- 154..... مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
- 155..... بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
- 156..... ہے بزمِ بٹاں میں سخن آزرده لبوں سے
- 157..... غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
- 159..... کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
- 160..... درد سے میرے ہے تجھ کو یہ قرار ہی ہاے ہاے!
- 162..... سرشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے



- 163..... گر خامشی سے فائدہ اخفا سے حال ہے
- 164..... ایک جا حرفِ وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا
- 165..... مری ہستی، فضاے حیرت آباد تمنا ہے
- 166..... چشمِ خواباں خامشی میں بھی نوا پر داز ہے
- 167..... عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
- 169..... ہے آرمیدگی میں نکو ہش بجا مجھے
- 170..... اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کی
- 172..... رفتارِ عمر، قطع رہِ اضطراب ہے
- 173..... دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
- 176..... سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
- 177..... دل سے تری نگاہ، جگر تک اتر گئی
- 179..... تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
- 180..... کوئی دن، گر زندگانی اور ہے
- 181..... کوئی اُمیدِ بے نہیں آتی
- 182..... دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
- 183..... کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ عالیہ مو آئے
- 185..... پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
- 186..... بچوں تہمت کشِ تسکین نہ ہو، گر شادمانی کی
- 186..... نکو ہش ہے سزا، فریادی بیدا دلبر کی
- 187..... بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
- 189..... جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
- 189..... ظلمتِ کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
- 191..... آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
- 193..... جس بزم میں تو ناز سے گنتار میں آوے
- 195..... حُسنِ مہر، گر چہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
- 197..... نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی



- 198.....عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
- 199.....شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
- 201.....ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ”تو کیا ہے“؟
- 203.....میں انہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں
- 204.....غیر لیں محفل میں، بو سے جام کے
- 205.....پھر اس انداز سے بہار آئی
- 206.....کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
- 208.....جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی
- 209.....سیماب، پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
- 210.....چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
- 212.....ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
- 214.....نکتہ چیں ہے، غم دل اُس کو سنائے نہ بنے
- 216.....چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے
- 217.....وہ آ کے، خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
- 218.....تپش سے میری، وقف کش کش ہر تارِ بستر ہے
- 220.....ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
- 220.....کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
- 221.....کیوں نہ ہو چشمِ بیاں محو تغافل، کیوں نہ ہو؟
- 221.....دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے
- 223.....دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ افشانی مجھے
- 224.....یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
- 255.....حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آمائش ہے
- 227.....کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ
- 228.....زبکہ مشقِ تماشا جوں علامت ہے
- 229.....لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزمِ مین جا دے مجھے
- 230.....باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے



- 232..... کہوں جو حال، تو کہتے ہو، "مذعا کہیے"
- 234..... رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے
- 236..... عرضِ نازِ خموشی دندان، برائے خندہ ہے
- 237..... جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
- 239..... ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
- 240..... بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے!
- 241..... باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
- 243..... ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
- 246..... ہجومِ نالہ حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
- 247..... خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے
- 247..... جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے
- 249..... آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جے
- 250..... شبِ نیم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زادہ ہے
- 252..... منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی
- 254..... غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
- 255..... مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
- 258..... نوید امن ہے بیدار دوست جاں کے لئے
- 260..... منقبت میں
- 262..... مطلع ثانی
- 263..... منقبت میں
- 267..... ہاں! مہ نو! سنیں ہم اُس کا نام
- 268..... زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
- 270..... قصیدہ
- 271..... گنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
- 273..... مثنوی در صنفِ اثبہ
- 275..... قطعات



278.....	در مدح ڈلی
280.....	بیان مصنف
282.....	مدح
283.....	ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر، چلو
284.....	در مدح شاہ
286.....	قطعہ
286.....	گزارش مصنف بحضرت شاہ
290.....	رباعیات
296.....	ضمیمہ
298.....	اپنا احوال دل زار، کہوں یا نہ کہوں!
299.....	ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
300.....	مجلس شمع عذراں میں جو آ جاتا ہوں
301.....	شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
302.....	میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
303.....	کئے تو شب کہیں، کائے تو سانپ کہلاوے
304.....	آپ نے مَسْنِی الضَّرِّ، کہا ہے تو سہی
305.....	لطفِ نظارۂ قاتل، دم بکل آئے
307.....	بہادر شاہ ظفر
311.....	قصیدہ
320.....	مثنوی
321.....	قطعات
324.....	قطعہ تاریخ اختتام کتاب
332.....	فردیات
335.....	نسخہ حمید





## مرزا اسد اللہ خاں غالب

ولادت آگرہ: ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء

وفات دہلی: ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

### مختصر حالات زندگی:

نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطابات، اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ عرف اور غالب تخلص تھا والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ جو سپاہی پیشہ تھے وہ ریاست اودھ، ریاست حیدرآباد اور ریاست الور سے وابستہ رہے مرزا غالب نے ابھی پانچویں برس میں قدم رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ کے ذمہ ہوئی جو مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد میں صوبیدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے، ڈیڑھ لاکھ روپے کی جاگیر بھی تاحیات عطا ہوئی تھی انہوں نے اس دُرِ یتیم کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر گھرِ محبت و الفت بنائے۔ نو برس کی عمر میں شفیق چچا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ تنخواہ بند اور جاگیر ضبط ہو گئی۔ مرزا انھیال میں آگئے یہاں ان کے نانا خواجہ غلام حسین نے انہیں ہر طرح کی آسائش بہم پہنچائی۔ یہ زمانہ غالب کی بے فکری اور فراغت کا زمانہ تھا۔ تعلیم و تربیت کے لئے مولوی معظم علی، نظیر اکبر آبادی، اور ملا عبدالصمد پاری جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ۱۳ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب الہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم



سے ہوئی۔ شادی کے بعد دلی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ اگرچہ اس ذوق کی تکمیل دلی میں ہوئی۔

غالب مالی طور پر ہمیشہ تنگ دست رہے اگرچہ تنگ دستی میں ان کی شاہ خرچی کو بھی بڑا دخل ہے۔ چچا کی پنشن میں سے انہیں بھی حصہ ملا کرتا تھا۔ جو بعض وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ اس کی بحالی کے لئے مرزا نے بہت جتن کئے۔ کلکتہ میں مقدمہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ واپس آتے ہوئے لکھنؤ اور بنارس کی سیر کی نواب نصیر الدین حیدر والی ریاست اودھ کا قصیدہ لکھا۔ پانچ صد روپے سے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا مگر دو سال بعد ریاست کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مغلیہ دربار سے وابستگی، حتیٰ کہ ذوق کی وفات کے بعد ”استادشہ“ ہو جانے پر بھی انہیں آسودگی حاصل نہ ہوئی۔ نواب رامپور یوسف علی خاں کی طرف سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ دوست احباب اور شاگرد خبر گیری کرتے تھے افسوس وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوا۔ جس کی نوعمری کا زمانہ نہایت ریسانہ، ٹھاٹھ باٹھ سے گذرا، اس کو صرف ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے ساری عمر غریبانہ حال سے بسر کرنا پڑی۔ وہ ”گردش مدام“ سے گھبرائے ضرور کہ تقاضائے بشریت ہے۔ مگر انہوں نے گردش مدام کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے ان کی طبعی خوش طبعی ان کے آڑے آئی انہوں نے بڑے سے بڑے صدمے کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اور بالآخر اپنے خالق سے جا ملے۔

### تصانیف:

- (۱) دیوان اردو (۲) کلیات نظم فارسی (۳) کلیات نثر فارسی (۴) غزو ہندی (اردو خطوط) (۵) اردوئے معلیٰ (اردو خطوط) (۶) لطائف غیبی (علمی مباحثے) (۷) قاطع برہان (مشہور فارسی) لغت ”برہان قاطع“ پر اعتراضات (۸) تنقیر (۹) غالب نامہ (دونوں کتابیں قاطع برہان کے ضمن میں ہیں) (۱۰) پنج آہنگ (فارسی انشاء پروازی اور خطوط)، (۱۱) مہر نیمروز (تاریخ مغلیہ۔ امیر تمیوز سے ہمایوں تک) (۱۲) دستنبو (جنگ آزادی ۱۹۵۷ء کے



حالات) (۱۳) سبد چین (فارسی قصائد، قطعات اور خطوط)

## غالب کی شاعرانہ عظمت:

غالب دنیائے شاعری کے ان چند درخشندہ ستاروں میں سے ہیں جن کی آب و تاب سے جہانِ شعر منور ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا انحصار ان کی جدت پسندی اور منفرد لب و لہجہ پر ہے انکے ہاں پیرایہ بیان میں دلفریبی کے علاوہ موضوعات کا بے حد تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کہتے ہیں۔ ”لوح سے تحت تک بمشکل سو صفحات ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس کی زندگی کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔“ قدرت نے غالب کو وسیع مشاہدہ اور عمیق قوتِ تخیلہ سے نوازا تھا اسی لئے وہ شاعری کی سابقہ روایات سے یکسر روگردانی کر کے زبان و بیان اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک ایسا معیار مقرر کرتے ہیں جو اپنے اندر وسعت بھی رکھتا ہے اور جدت بھی۔ غالب تجربات و واقعات زندگی کو انوکھے اور منفرد زاویے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی جولانی طبعِ ندرتِ فکر و خیال اور جدتِ ادا کی بدولت اردو شاعری کے قاری کو ایک نئے انداز میں سوچنا اور محسوس کرنا سکھایا اور بقول ڈاکٹر عبدالسلام ”ایک نیا ذہن، نیا شعور، نیا ماحول اور نیا نسب عطا کیا۔“ اسی بنا پر ایک نئے لب و لہجہ کی وجہ سے غالب اپنے روایت پسند دور میں نامقبول ہوا۔ لیکن بعد میں آنے والے دور میں جب فہم و ادراک کا محور وسیع ہوا تو غالب کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جو انسانی جذبہ و احساس کو متاثر کرنے کے علاوہ تفکر اور ذہن (Intellect) کو بھی اپیل کرتا ہے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کرتا۔

غالب کی شاعری کا نقادوں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور مشکل پسندی کا ہے۔ جس میں فارسی کے مشکل گو شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس دور میں غالب مشکل الفاظ اور تراکیب اور دور از کار تشبیہات و استعارات لاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔



طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا  
اسد اللہ خان قیامت ہے

جلد ہی وہ فارسیت اور نازک خیالی کو خیر باد کہہ کر سادہ گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ دوسرے دور میں زبان و بیان قدرے صاف ہے۔

تیسرا دور غالب کے کمالِ فن کی آخری منزل ہے جس میں سادگی و پرکاری کا سارا لطف موجود ہے۔

## خصوصیاتِ کلام

جدت پسندی:

کلام غالب کی بنیادی خصوصیات جدت پسندی ہے ان کے ہاں جدت ادا، جدت مضامین، جدت تشبیہات و استعارات اور جدت خیال، غرض ہر پہلو سے انوکھا اور نرالا انداز ملتا ہے۔

بقول مولانا حالی: ”جس روش پر دوسرے چل رہے تھے، مرزا نے اس سے الگ ایک نئی روش تلاش کی“

موت کا ایک دن معین ہے  
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی  
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا  
جامِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

جدت ادا:

غالب کی شاعری میں جہاں نئے نئے موضوعات اور مضامین بیان ہوئے ہیں وہاں ان کا طرزِ ادا بھی منفرد ہے وہ معمولی سے معمولی بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ وہ بہت



ہی دلچسپ اور دل نشین بن جاتی ہے۔ طرزِ ادا کی اس خوبی کا خود غالب کو بھی احساس تھا وہ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن در بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

غالب دوسرے شعراء کے بیان کردہ خیالات اور پامال مضامین کو اس حسن و خوبی

سے بیان کرتے ہیں کہ وہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں طرفگاہی ادا کی صفت غالب

کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ بقول آل احمد سرور۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کا قصران کی جدت طرازی پر تعمیر ہوا ہے۔

ہوں کو ہے نشاطِ کار کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تیری وفا سے ہو تلافی کہ دہر میں

ترے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ایجاز و اختصار:

غزل میں بات کو ڈھکا چھپا کر کہنا اس کی بنیادی خصوصیت ہے چنانچہ کلام غالب کی

ایک ممتاز صفت ایجاز و اختصار ہے وہ کم سے کم الفاظ میں بڑے بڑے مفہیم کو یوں ادا کرتے

ہیں کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ ”گنجینہ معنی کا

طلسم“ ہے وہ شعر میں ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں جن سے تہ در تہ معنی کی گرہیں

کھلتی جاتی ہیں۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہدم

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیوں ہو



دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز  
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

مضمون آفرینی:

غالب کے نزدیک شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ مضمون آفرینی ہے۔ وہ اشعار میں عجیب و غریب اور خیال افروز نکتے اور باریکیاں بیان کرتے جاتے ہیں غالب کا باریک بین ذہن معمولی بات کے ایسے پہلو پر جا پہنچتا ہے جس تک دوسروں کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق  
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شوخی اور ظرافت:

غالب ایک شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ اور بقول حالی نکتہ داں، نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے۔ ان کی ذاتی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار تھی پھر ان کا دور بھی مصائب اور ابتلاء کا دور تھا۔ لیکن غالب مزاج کے اعتبار سے انسانوں کی اس صف میں تھے جو غم میں مسکراتے ہیں۔ چنانچہ داخلی اور خارجی اعتبار سے مایوسی کے باوجود غالب کو جس چیز نے زندہ رکھا وہ ان کے مزاج کی زندہ دلی اور ہمہ گیری ہے۔ یہی زندہ دلی ان کی زندگی کی طرح شاعری اور خطوط میں بھی نہایت شگفتہ اور تروتازہ پھول کھلاتی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی  
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے



پہلو داری:

ہفتہ کی نظم

غالب کی شاعری ایک اور نمایاں خوبی پہلو داری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اکثر اوقات دو دو مفہیم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بظاہر ایک معنی ادا کرتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے پر ایک اور معنی ذہن میں آتے ہیں جو نہایت پر لطف کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی ”غالب کے اشعار ایک تراشے ہوئے نگینے کی مانند ہیں جو ہر پہلو سے ایک نیا انداز دکھاتا ہے“

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے  
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا  
دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں  
خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں  
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق  
ہے مقرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

فلسفہ و حکمت:

غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں فلسفیانہ رموز اور حکیمانہ افکار بیان ہوئے ہیں ان سے قبل تصوف کے موضوعات عام تھے لیکن فلسفہ اور حکمت کے موضوعات ناپید تھے اگرچہ غالب باقاعدہ فلسفی نہیں تھے لیکن اپنے اشعار میں انہوں نے بعض اوقات ایسے رموز بیان کئے کہ وہ فلسفہ کی ضخیم کتابوں پر بھی بھاری ہیں غالب کا طرز استدلال فلسفیانہ ہے وہ حقائق کو فلسفیانہ نظر سے جانچنے کے عادی تھے جس سے بات میں وزن پیدا ہوتا

ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو چیز مرگ علاج  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک



قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں  
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

### انسانی نفسیات کی عکاسی:

غالب انسانی فطرت اور نفسیات کے گہرے رمز آشنا تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے تھے انہوں نے انسانی مزاج کی بوقلمونیوں کو زبان شعر میں بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں انسانی نفسیات، انسانی مزاج اور انسانی مسائل و حقائق کی گہری آگاہی نظر آتی ہے۔

رنج سے خوگر ہو انسان تو مٹ جاتا ہے رنج  
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں  
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا  
کہ ہوگا باعث افزائش سوزِ دروں وہ بھی  
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

### روایت شکنی:

غالب طبعاً ایک جدت طراز اور روایت شکن انسان تھے ان کی زندگی، شاعری، اور خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ہر معاملے میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے۔ غالب کے مزاج میں خود پسندی حد درجہ تھی ان کے نظریات و تصورات اور سوچنے کے انداز میں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے چنانچہ وہ بعض اوقات مروجہ عقائد و نظریات سے روگردانی کرتے ہیں اور روایتی خیالات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ایسے تصورات جنہیں تقدس کا درجہ حاصل ہے ان پر طنز اور چوٹ کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنی ذات کو بھی نہیں بخشے اور خدا تک سے بھی شوخی کر جاتے ہیں۔ محبوب، شیخ، زاہد، جنت و دوزخ، خضر، واعظ، حوریں، غرض کوئی بھی ان کے



نشرِ تنقید سے نہیں بچ سکا یہ سب ان کے مزاج کی جدت طرازی اور انفرادیت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

چاہتے ہیں خو بُد یوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

پکڑتے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا کیا خضر نے سکندر سے!

اب کسے رہنا کرے کوئی!

ایسی جنات کا کیا کرے کوئی!

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

والسلام: ادارہ







نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا  
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ  
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوے شیر کا

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے  
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے  
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیر پا  
موئے آتش دیدہ، ہے حلقہ مری زنجیر کا





جراحتِ تحفہ، الماس اُرمغاں، داغِ جگر ہدیہ  
مُبارک باد، اسد! غمخوارِ جان، درد مند آیا



جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار  
صحرا مگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا

آشفگی نے نقشِ سویدا کیا درست  
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ  
جب آنکھ گھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

ابھی تک

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبقِ ہنوز  
لیکن یہی کہ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی  
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تپشے بغیر ہر نہ سکا کوہکن، اسد!  
سرکشہ خمارِ رسوم و قیود تھا





کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا  
دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیت کا مزا پایا  
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم  
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری  
حسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا

غنجِ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل  
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی  
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخمِ پرِ نمک چھوڑا  
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟





دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا  
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں  
آگِ اس گھر میں لگی ایسی کہ جوتھا، جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا  
میردا آہِ آتشیں سے بالِ عنتا جل گیا

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں  
کچھ خیال آیا تھا، وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار  
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب! کہ دل  
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا





شوق، ہر رنگ رقیبِ سرو سماں نکلا  
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب!  
تیر بھی سینہ بکل سے پر افشاں نکلا

بُوے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل  
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا ماندہ لذتِ درد  
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دُشوار پسند  
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شورا اٹھایا غالب!  
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا





دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا  
 عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا  
 تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا  
 اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگِ زرد تھا  
 تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں  
 مجموعہ خیال ابھی فردِ فرد تھا  
 دل تا جگر کہ ساحلِ دریاے خوں ہے اب  
 اس رہزور میں جلوہ گل، آگے گرد تھا  
 جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی  
 دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا  
 احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے  
 زنداں میں بھی خیالِ بیاباں ٹوڑا تھا  
 یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے  
 حقِ مغفرت کرے! عجب آزادِ مرد تھا





شمارِ سنجہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا  
تماشاے یہ یک کفِ بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلیِ نومیدیِ جاوید آساں ہے  
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گلِ آئینہٴ بیمبریِ قاتل  
کہ اندازِ بخوں غلغلیہِ بکل پسند آیا





دہر میں نقشِ وفا دجہ تسلی نہ ہوا  
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا  
یہ زمرد بھی، حریف دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں  
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی  
گر نفسِ جادہ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی  
گوشِ منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے  
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمہ یک جنبشِ لب سے غالب  
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا





ستایشگر ہے زاہدِ اس قدر جس باغِ رضواں کا  
وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیداؤ کاوشیائے مرگاں کا  
کہ ہر یک قطرہ خونِ دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانعِ میرے نالوں کو  
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے  
مرا ہر داغِ دل اک ختم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے  
کرے جو پر تو خورشیدِ عالم شبنمستان کا

مری تعمیر میں مضر ہے اک صورتِ خرابی کی  
ہولی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا



اُگا ہے گھر میں ہر سو سبز، ویرانی تماشا کر  
مدارِ آب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں  
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہندزاک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے  
دلِ افسردہ، گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ  
سب کیا، خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا  
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مڑگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالب! کہ  
یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا





نہ ہو گا' یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا  
حبابِ موجہٴ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بید ماغی ہے  
کہ موجِ بے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا



سراپا رہن عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی  
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی  
جو تو دریا سے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا





محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے  
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہاے ناز کا

تو، اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز!  
میں، اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا!

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں، میرا، وگرنہ میں  
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے  
ہر گوشہ بساط ہے سرشیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز  
ناخن پہ قرضِ اس گرہ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدا!  
سینہ، کہ تھا دقینہ، گہر ہاے راز کا





بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر گھلا  
رکھو یارب! یہ درِ گنجینہ گوہر گھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا  
اس تکلف سے کہ گویا بکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب  
آستیں میں دشمن پہناں ہاتھ میں نشتر کھلا

کو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید  
پر یہ کیا کم سے کہ مجھ سے وہ بری پیکر کھلا



ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال  
خُلد کا اک دَر ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں  
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا  
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول  
آج ادھر ہی کو رہیگا دیدہ اختر کھلا؟

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال  
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند  
واسطے جس شے کے غالب! گنبد بے در کھلا





شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا  
شعلہ جوالہ، ہر یک حلقہ گرداب تھا

واں کرم کو، عذری بارش تھا عنائیکر خرام  
گریے سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال  
یاں ہجوم اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبخو  
یاں رواں مڑگان چشم تر سے خونِ ناب تھا

یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو  
واں وہ فرق ناز، محو بالش کخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بخودی  
جلوہ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا

فرش سے تاعرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا  
نیاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونا بہ ٹپکانے لگا  
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا





نالہٴ دل میں شبِ اندازِ اثرِ نایاب تھا  
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاطِ آہنگ ہے!  
خانہٴ عاشقِ مگر سازِ صداے آب تھا

نازشِ لایمِ خاکستر نشینی، کیا کہوں  
پہلوے اندیشہ، وقفِ بشرِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے بخونِ نارِ سانسے، ورنہ یاں  
ذرہ ذرہ روکشِ خرشیدِ عالم تاب تھا

ق

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟  
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا  
انتظارِ صید میں اک دیدہٴ بیخواب تھا

میں نے روکا راتِ غالبِ کو، مگر نہ دیکھتے  
اس کے سبلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دنیا پڑا حساب  
خونِ جگر، ودیعتِ مرگانِ یار تھا

اب میں ہوں، اور ماتمِ یک شہرِ آرزو  
توڑا جو تو نے آئینہ، تمثالِ دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھر وہ کہ میں  
جاں دادہ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سراپِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال  
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغِ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر آب  
دیکھا، تو کم ہوئے یہ غمِ روزگار تھا





بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آدمی کو بھی میٹر نہیں انساں ہونا

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی  
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وایے دیوانگی شوق، کہ ہر دم مجھ کو  
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے  
جو آئینہ بھی چاہے ہے مرگاں ہونا



عشرتِ قتلگاہِ اہلِ تمنا مت پوچھ  
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط  
تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارہٴ دل، زخمِ تمنا کھانا  
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ  
ہائے اس زودِ پشیمان کا پشیمان ہونا!

حیف، اُس چارہ گرہ کپڑے کی قسمتِ غالب!  
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا





شبِ خمارِ شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا  
تاجِ بادہ، صورتِ خانہ خمیازہ تھا

یک قدمِ وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا  
جادہِ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشتِ خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے  
خانہِ مجنوںِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ متِ رسوائی اندازِ استغنائے حُسن  
دستِ مرہونِ جنا، رخسارِ رہنِ غازہ تھا

نالہٴ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد  
یادِ گارِ نالہٴ یک دیوانِ بے شیرازہ تھا





دوست، غمخواری میں میری سعی فرماوینگے کیا  
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور! کب تلک  
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماوینگے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرسِ راہ  
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاوینگے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں  
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاوینگے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قیدِ اچھا، یوں سہی  
یہ جنونِ عشق کے اندازِ مٹھٹ جاوینگے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں  
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراوینگے کیا!

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفتِ اسد!  
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاوینگے کیا؟





یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا  
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پہ جیسے ہم تو یہ جان، جھوٹ جانا  
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری ناڑ کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بُودا  
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

اور ہا کھچیا حیر

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیریمکش کو  
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوستِ ناصح  
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی عمکسار ہوتا



رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ، پھر نہ تھمتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگر چہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے  
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے  
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جوڑ سوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا  
جو دوائی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیانِ غالب!  
تجھے ہم دلی سمجھتے، جو نہ بادِ خوار ہوتا





ہوں کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!  
 تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟ کہاں تک اے سراپا ناز کیا، کیا  
 نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا!  
 نگاہ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکین آزما کیا!  
 فروغِ شعلہٴ خس، یک نفس ہے ہوں کو پاس ناموسِ وفا کیا!  
 نفسِ موجِ محیطِ بخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا  
 دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا  
 دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا  
 محابا کیا ہے میں ضامنِ ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!  
 سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا! سُن شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا  
 کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا  
 یہ قاتل، وعدہٴ صبر آزما کیوں؟ یہ کافر، فتنہٴ طاقت رُبا کیا!

بلاے جاں ہے غالبِ اُس کی ہر بات  
 عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا





در خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا  
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہیں کہ ہم  
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا  
رُوبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازِ ہمنامی چشمِ خواباں  
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا  
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا  
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا



ہر بنِ موسے دمِ ذکر نہ ٹپکے خواب  
حزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل!  
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے  
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، یہ تماشا نہ ہوا



اَسد! ہم وہ جوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں  
کہ سے سرِ منجہ مرگانِ آہو، پشتِ خار اپنا





پے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا  
 بخوں غلتیدہ صد رنگِ دعویٰ پارسائی کا  
 نہ ہو حسنِ تماشا دوستِ رسوا بیوفائی کا  
 بہ مہرِ صد نظرِ ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا  
 زکاتِ حسن دے اے جلوہٴ بینش! کہ مہرِ آسا  
 چراغِ خانہٴ درویش ہو، کاسہ گدائی کا  
 نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر  
 رہا مانندِ خونِ بے گنہ، حقِ آشنائی کا  
 حتمائے زبانِ محوِ سپاسِ بے زبانی ہے  
 مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا  
 وہی اک بات ہے جو یاں نفسِ واں نکہتِ گل ہے  
 چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا  
 وہاں ہر بُتِ پیغامہ جو زنجیرِ رسوائی  
 عدمِ تکِ بیوفا! چرچا ہے تیری بیوفائی کا  
 نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب! مختصر لکھ دے  
 کہ حسرتِ سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے جدائی کا





گرنہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا  
بے تکلف داغِ مہ، مُرِ وہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر بن ہوتا ہے آب  
پر تو مہتاب، سیلِ خانمں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ مگر  
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا  
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحان ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا  
مجھ پر گوارا کئے زمانہ مہربان ہو جائے گا



گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط  
شعلہِ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر  
ہر گل تر، ایک چشمِ خوں نشاں ہو جائے گا

واے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو  
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد!  
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا





دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا      میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو      اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا  
 ہم کہاں قسمت آزماتے جائیں      تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا  
 کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب      گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا  
 ہے خبر گرم اُن کے آنے کی      آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟      بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی      حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
 زخمِ گر دب گیا، لہو نہ تھا      کامِ گر رُک گیا، روانہ ہوا  
 رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟      لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے، کہ لوگ کہتے ہیں

”آج غالب غزل سرا نہ ہوا“





گلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگی جا کا  
گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو، اور پانچ مکتوب!  
مگر ستمزدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی  
دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیشِ دنیا کا

غمِ فراق میں، تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو  
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں  
کرے ہے ہر بنِ مو، کامِ چشمِ بینا کا



دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے  
ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا!

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے  
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یادِ اسدا!  
جفا میں اُس کی ہے اندازِ کار فرما کا



قطرہٴ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا  
نِظِ جامِ مے، سرا سر رشتہٴ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا  
غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے  
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟





یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا  
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے بے، کے ہے طاقت آشوبِ آگہی  
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایام کا

بلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہائے گل  
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشہ فکرِ سخن مجھے  
تیرا کی قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سوارِ بدِ عشق سے آزاد ہم ہوئے  
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار  
یہ میکدہ خراب ہے نئے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل  
ایر بہار، ٹھکدہ کس کے دماغ کا!





وہ مری چینِ جبین سے غمِ پنہاں سمجھا  
 رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا  
 یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز  
 چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریاں سمجھا  
 شرحِ اسبابِ گرفتاری خاطر مت پوچھ  
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا  
 بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام  
 رُخ پہ ہر قطرہ عرقِ دیدہ حیراں سمجھا  
 عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا  
 نبضِ کس سے تپشِ شعلہٴ سوزاں سمجھا  
 سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی  
 ہر قدم سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا  
 تھا گریزاں مژدہٴ یار سے دلِ تاومِ مرگ  
 دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا  
 دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدا  
 غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا





پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا      دل جگر تھنہ فریاد آیا  
 دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز      پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا  
 سادگی ہائے تمنا، یعنی      پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا  
 عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل!      نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا  
 زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی      کیوں ترا راہگزر یاد آیا  
 کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی      گھر ترا خلد میں گر یاد آیا  
 آہ وہ جراتِ فریاد کہاں      دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا  
 پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال      دل گم گشتہ مگر یاد آیا  
 کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!      دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدا

سنگ اٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا





ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!  
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا!

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ  
اُس میں کچھ شائبہِ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں  
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نچیر بھی تھا؟

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زُلف کی یاد  
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا!  
بات کرتے، کہ میں لبِ تشنہِ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر کوئی  
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا



دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا  
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھے نہ فرہاد کو نام  
ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا، نہ سہی  
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق  
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

رمختے کے تمہیں استاد نہیں ہو، غالب!  
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا



لب خشک در تنگیِ مُردگان کا      زیارتِ کدہ ہوں دلِ آزردهاں کا  
ہمہ نا امیدیِ ہمہ بدگمانی      میں دلِ ہوں فریبِ وفا خوردگان کا





تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا  
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ قضا نے  
خرشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازہ ہمت، ہے ازل سے  
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم  
میں معتقدِ فتنہِ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل آزر دگی یار سے خوش ہوں  
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تیگِ آبی سے ہوا خشک  
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی، اسدا! داغِ جگر سے مری تحصیل  
آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا





شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا  
رشتہ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے جا  
کس قدر، یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا، مجھ شکستِ آرزو  
دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں، بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں  
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منت کیموس تھا



آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے  
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!  
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے  
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا





عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا  
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا  
 جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے  
 ہوں شمعِ کُشتہ، درِ خورِ محفل نہیں رہا  
 مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں  
 شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا  
 بر رُوے شش جہت درِ آئینہ باز ہے  
 یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا  
 وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن  
 غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا  
 گو میں رہا رہنِ ستمہائے روزگار  
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا  
 دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں  
 حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا  
 بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا  
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا





رشتک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف!  
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا!

دُڑہ دُڑہ ساغرِ میخانہ نیرنگ ہے  
گردشِ مجنوں بہ چشمکِ ہائے لیلِ آشنا

شوق ہے ساماں ترا زنا زشِ اربابِ عجز  
دُڑہ صحرا دستِ گاہ و قطرہ دریا آشنا

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے  
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہِ سنجِ رشتکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے  
میرا زانوِ مولیٰ اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکنِ نقاشِ یک تماشِ شیریں تھا اسدا  
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا





ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا  
 بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا  
 مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب!  
 آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا  
 منظر اک بلندی پر اور، ہم بنا سکتے  
 عرش سے ادھر ہوتا، کاشکے مکاں اپنا!  
 دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالینگے  
 بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا  
 درِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلا دوں  
 انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا  
 گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا  
 تنگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا  
 تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو  
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا  
 ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے  
 بے سبب ہوا، غالب! دشمن آسماں اپنا





سُرمۂ مُفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے  
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساسِ میرا  
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!  
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا



غافل بہ وہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں  
بے شانہ صبا نہیں طرہ گیہا کا  
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ  
صیدِ زدام جتہ ہے اس دامگاہ کا  
رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے  
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا  
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے  
پر گلِ خیالِ زخم سے دامنِ نگاہ کا  
جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسدا  
پروانہ ہے وکیلِ ترے دادِ خواہ کا





بُور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا!  
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!

رات دن گردش میں ہیں، سات آسماں  
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ  
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا!

ہو لئے کیوں نامہ، کے ساتھ ساتھ  
یا رب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا!

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے  
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ  
ر گئے پر، دیکھے دکھلائیں کیا!

پوچھتے ہیں وہ کہ، غالب کون ہے؟  
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!





لطافت بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی  
چمن، زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا  
حریف جوشش دریا، نہیں خودداری ساحل  
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا



عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
درد کا حد سے گزرنے کا دوا ہو جانا

تجھ سے، قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد  
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کش مکش چارۂ زحمت میں تمام  
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ!  
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!



ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا  
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹا تری انکشتِ حنائی کا خیال  
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے، ابر بہاری کا برس کر گھلنا  
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکبتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس  
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گلِ ذوقِ تماشا غالب!  
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تاکہ تجھ پر گھلے اعجازِ ہوائے صیقل  
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا



## ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال گشا موج شراب  
دے بٹے کو دل و دستِ ثنا، موج شراب

پوچھ مت وجہ یہ مستی اربابِ چمن  
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

جو ہوا غرقہ ہے، بختِ رسا رکھتا ہے  
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موج شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر  
موج ہستی کو کرے، فیضِ ہوا موج شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو  
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موج شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تھنہ ناز  
دے ہے تسکین بہ دم آبِ بقا موج شراب



بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر  
شہپر رنگ سے ہے بال گُشا موجِ شراب

موجہٴ گل سے چراغاں ہے گزرِ گاہِ خیال  
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محو تماشا سے دماغ  
بسکہ رکھتی ہے سر نشوونما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیتِ فصل  
موجہٴ سبزہٴ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامہٴ ہستی ہے زہے موسمِ گل!  
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب!

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوہٴ گل دیکھ اسدا!  
پھر ہوا وقت کہ ہو بال گُشا موجِ شراب



## ت

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے  
 جن لوگوں کی تھی درِ خورِ عقدِ گہرا نگشت  
 کافی ہے نشانی تری، جھلے کا نہ دینا  
 خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفرِ انگشت  
 لکھتا ہوں، اسد! سوزِ دل سے سخن گرم  
 تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت



رہا گر کوئی تا قیامت سلامت  
 جگر کو مرے عشقِ خونا بہ مشرب  
 علی الزعمِ دشمنِ شہیدِ وفا ہوں  
 پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت!  
 لکھے ہے خداوندِ نعمت! سلامت  
 مبارک مبارک سلامت سلامت  
 نہیں گر سروِ برگِ ادراک معنی  
 تماشاے نیرنگِ صورت، سلامت





مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالب!  
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت



آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست  
دُورِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رُخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر  
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجئے  
صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتہ رفتارِ دوست

عشق میں، بیدارِ رشکِ غیر نے مارا مجھے  
کشتہ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ماروِشن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے  
دیدۂ پُر خون ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست



## ق

غیر یوں کرتا ہے میری پُرسش، اُس کے ہجر میں  
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک  
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہِ ضعفِ دماغ  
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے، اگر  
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے  
یا بیان کیجئے پاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ  
ہے رویتِ شعر میں غالب! زبں تکرارِ دوست



## ج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج  
قُمری کا طوق، حلقہٴ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغاں کے ساتھ  
تارِ نفس، کمرِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل  
سیلابِ گریہ در پے دیوار و در ہے آج



لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں  
لہجھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج



چ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ  
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمی سہی تلاشِ دید نہ پوچھ  
برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانہِ راحت ہے انتظارِ اے دل  
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرتِ نظارۂ زگس  
بہ کوریِ دل و چشمِ رقیبِ ساغر کھینچ

بہ نیمِ غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز  
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں  
بروے سفرہِ کبابِ دلِ سمندر کھینچ



و

حُسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد  
 بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد  
 مصِیبِ شیفِتگی کے کوئی قابل نہ رہا  
 ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد  
 شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے  
 شعلہٴ عشق یہ پوش ہوا میرے بعد  
 خوں ہے دل خاک میں احوالِ بٹاں پر، یعنی  
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ جنا میرے بعد  
 درِ خورِ عرض نہیں جوہرِ بے داد کو جا  
 نگہِ ناز ہے سرے سے خفا میرے بعد  
 ہے بچوں اہلِ بچوں کے لئے آغوشِ وداع  
 چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد  
 کون ہوتا ہے حریفِ مر دافکنِ عشق  
 ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد  
 غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی  
 کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد  
 آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب!  
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد



د

نکلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار  
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

و فورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ  
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار  
گئے ہیں چند قدمِ پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانی سے جلوہ  
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سوداے انتظار تو آ  
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار



نجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے  
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سہاے سے  
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی  
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودی عیشِ مقدمِ سیلاب  
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہ کسی سے کہ غالب، نہیں زمانے میں  
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار





گھر، جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  
جائے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن  
”جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر“

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں  
لیوے نہ کوئی نام ”ستم گر“ کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگر نہ ہم  
سرجائے یار ہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا  
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر



مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام  
چلتا نہیں ہے، دشمن و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو  
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات  
سنا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض  
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر





کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار دیکھ کر  
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے  
سرگرمِ نالہ ہاے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروے عشق، جہاں عام ہو جفا  
رکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے  
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ، خونِ خلق  
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر



وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ  
ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

پک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ  
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُتار باندھ، سُجھِ صد دانہ توڑ ڈال  
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں  
جی خوش ہوا ہے راد کو پُر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے  
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گر نی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر  
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدحِ خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا  
یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر





لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہر درخشاں پر  
 میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہوا پر بیاباں پر  
 نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی  
 سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر  
 فنا تعلیم درسِ بخودی ہوں اُس زمانے سے  
 کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر  
 فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے  
 بہم گر صلح کرتے پارہ ہاے دل نمکداں پر  
 نہیں اقلیم اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا  
 کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ عنوان پر  
 مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا  
 کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر  
 بجز پردازِ شوقِ ناز، کیا باقی رہا ہو گا!  
 قیامت اک ہوائے مہم ہے خاکِ شہیداں پر  
 نہ لڑنا صح سے غالب کیا ہوا اگر اُس نے ہدایت کی  
 ہمارا بھی تو آخر زور چلا ہے گریباں پر





ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور  
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات  
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابو سے ہے کیا اُس نگہ ناز کو پیوند  
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُنھیں گے  
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں  
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سبک گراں اور



ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا  
ہوتے اجو کئی دیدہ خونا بہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند کہ سراڑ جائے  
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ”ہاں اور“

لوگوں کو ہے ٹرشدِ جہانتاب کا دھوکا  
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین  
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور





صفائے حیرتِ آئینہ ہے سمانِ زنگِ آخر  
تغیر، آبِ برجاماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر  
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر و حشت کی  
ہوا جامِ زمر و بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ عریانی  
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر  
برنگِ کاغذِ آتشِ زدہ نیرنگِ بیتابی  
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تمیدن پر  
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے  
متاعِ مردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرضِ رہزن پر  
ہم اور وہ بے سبب رنجِ آشنا دشمن کہ رکھتا ہے  
شعاعِ مہر سے تہمتِ نگہ کی چشمِ روزن پر  
فنا کو سوئے، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا  
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوفِ گلشن پر  
اسدِ بسل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے  
کہ ”مشرقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر“





ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواہاں تجھ پہ عاشق ہیں  
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا  
ہوں در پہ ترے نا صیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: قیامت کو ملیں گے  
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور



ہاں، اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف  
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے  
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے!  
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی  
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گُزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش  
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ ”کیوں جیتے ہیں“ غالب!  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور



## ذ

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانند صبح و مہر  
 ہے داغِ عشقِ زینتِ جیبِ کفنِ ہنوز  
 ہے نازِ مفلساں زیرِ از دست رفتہ پر  
 ہوں گلِ فروشِ شوخیِ داغِ گہنِ ہنوز  
 میخانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں  
 خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیداد فنِ ہنوز

## ○

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسوںِ نیاز  
 دعا قبول ہو یا رب! کہ عمرِ خضر و راز  
 نہ ہو بہ ہر زہِ بیاباں نورد و ہم وجود  
 ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز





وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں  
 کہ دستِجے آئینہ انتظار کو پرداز  
 ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست  
 گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہ ناز  
 نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں، غالب!  
 جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز



وسعتِ سعی کرم دیکھ کہ سرتا سرخاک  
 گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز  
 یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحہ دشت  
 نقشِ پا میں ہے تب گرمی رفتار ہنوز





کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز  
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز!  
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے  
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز  
تاب لائے ہی ہوگی غالب!  
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو، اور آرایشِ خم کا کل  
میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکین: فریبِ سادہ دلی  
ہم ہیں، اور رازِ ہائے سینہ گداز



ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد

درنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس شکر سے

ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں

جس سے مرگاں ہوئی نہ ہو گلاباز

اے ترا غزۂ یک قلم انگیز

اے ترا ظلم، سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو

ریزشِ سجدۂ جمینِ نیاز

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے دریغ، وہ رند شاہدِ باز!



س

مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے  
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تھنہ آزار، تسلی نہ ہوا  
ہوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے!  
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے  
دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہن شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل!  
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے  
خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سرِ غالب وحشی ہے ہے!  
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس



## ش

نہ لیوئے، گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے  
لگائے خانہ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکل عاشق  
نہ نکلے شمع کے پاسے، نکالے گر نہ خار آتش

## ع

جاوہِ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع  
چرخِ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع





رُخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع  
ہوئی ہے آتشِ گلِ آبِ زندگانی شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی  
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام  
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہِ خونی شمع

غمِ اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلے!  
جرے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع

ترے خیال سے روحِ اہتراز کرتی ہے  
بہ جلوہ ریزیِ بار و بہ پر نشانی شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ  
شکستہ کی ہے حمیدِ گلِ خزنی شمع

جلے ہے، دیکھ کے ہالین پار پر مجھ کو  
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگلی شمع



## ف

بیمِ رقیب سے نہیں و داغِ ہوش  
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیارِ حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے  
اے ناتمامی نفسِ شعلہ بار حیف!

## ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک  
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل  
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک



مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو  
نالہ بلبیل کا درد اور خندہ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج  
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجہ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ!  
✓ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانمک

✓ چھوڑ کر جانا تنِ مجروح عاشق حیف ہے  
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گائے تو فیر درد  
زخم، مثلِ خندہ قاتل ہے سرتا پانمک

یاد ہیں غالب! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں  
✓ زخم سے کرتا، تو میں پلوں سے چٹتا تھا نمک





آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک  
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ  
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب  
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم  
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل!  
گرمی بزم ہے اک رقص شر ہوتے تک

غم ہستی کا اسدا کس سے ہو جو مرگ علاج  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے بحر ہوتے تک



## گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ  
یعنی بغیر یکِ دلِ بے مُدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد  
مُجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

## ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفاے گل  
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہوائے گل

جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا  
اسے وائے نالہٴ لبِ خونیں نوائے گل!



خوش حال اس حریف، یہ مست کا کہ جو  
رکھتا ہو مثلِ سایہ گل، سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار  
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے  
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سلطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی  
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک  
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب! مجھے اُس سے ہم آغوشی آرزو  
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل



م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس  
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال  
ہیں ورقِ گردانی نیرنگِ یک بُخانا ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں  
ہیں چراغان، شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو  
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائمِ الحسبِ اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدا!  
جانتے ہیں سینہ پرِ خوں کو زنداں خانہ ہم





بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر  
متاعِ خانہ زنجیرِ جزو صدا معلوم



مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور  
رکھ لی مرے خدائے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کب میں ہیں اے خدا!  
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارتگی کی شرم



لوں دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوشِ ولے  
غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں





وہ فراق اور وہ وصال کہاں      وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں  
 فرصتِ کاروبارِ شوق کسے      ذوقِ نظارہٴ جمال کہاں  
 دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا      شورِ سوداے خط و خال کہاں  
 تھی وہ اک شخص کے تصور سے      اب وہ رعنائی خیال کہاں  
 ایسا آساں نہیں لبو رونا      دل میں طاقتِ جگر میں حال کہاں  
 ہم سے چھوٹا قمار خانہٴ عشق      واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں  
 فکر دنیا میں سر گھپاتا ہوں      میں کہاں! اور یہ وبال کہاں  
 مضحل ہو گئے قوی، غالب!  
 وہ عناصر میں اعتدال کہاں



کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں  
 ہوتی آئی ہے کہ اٹھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے  
 کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھتے کیا کہتے ہیں



اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو  
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش ہے  
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود  
قبلے کو، اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے  
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا  
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ  
اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہویں شاید  
مر گیا غالب آشفۃ نوا کہتے ہیں





آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں  
ہے گریباں تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں ہیں  
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب  
ڈرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

رواقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے  
انجمن بے شمع ہے، گر برقِ خرمن میں نہیں



زخمِ سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن  
غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سودن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے  
جلوہِ گل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اک ہیولیٰ ہے، نئے ناسور کا  
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزمِ آشامی مری  
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!  
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا، غالب! کہ ہو غربت میں قدر  
بے تکلف، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں





عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آ سکا  
گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں، چشم ہائے گشادہ بسوئے دل  
ہر تارِ زلف کو، نگہِ سرمہ سا کہوں

میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش  
تو، اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں

ظالم! مرے گناہ سے مجھے منفعل نہ چاہ  
ہے ہے، خدا نکر وہ، تجھے بیوفا کہوں!





مہرباں ہو کے بٹا لو مجھے، چاہو جس وقت  
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے  
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو سمگلر، ورنہ  
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں





ہم سے گھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن  
ورنہ ہم چھیڑینگے، رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غزۂ اوج بنائے عالمِ امکاں نہ ہو  
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں،  
رنگ لاو گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانے  
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں  
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب! پیشِ دتی ایک دن





ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں  
اک چھیڑ ہے، وگر نہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا  
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز  
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیتے، دشنام ہی سہی  
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ق

ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے  
ہر چند پشت گرمی تاب و توان نہیں



جاں، مُطربِ ترانہ ”هَلْ مِنْ مَزِيدٍ“ ہے  
لب، پردہ سنجِ زمزمہ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم  
دل میں پُھری چُھو، مودہ گر خونچکاں نہیں

ہے تنگ سینہ دل اگر آشکدہ نہ ہو  
ہے عارِ دل، نفس اگر آزر فشاں نہیں

نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب  
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو، کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں!  
گویا جبین پہ سجدہ بُت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی  
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ، ولے کیوں کہے، ابھی  
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں





مانع دشتِ نوردی کوئی تدبیر نہیں  
ایک چکر ہے، مرے پانو میں زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں  
جادہ، غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے  
جادہ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدی جاوید! گوارا رہیو!  
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر گھجاتا ہے، جہاں زخمِ سراچھا ہو جائے  
لذتِ سنگ بہ اندازہ تقریر نہیں

جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے  
کوئی تقصیر بجزِ خجلتِ تقصیر نہیں

غالب! اپنا یہ عقیدہ ہے، بقولِ ناسخ  
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقد میر نہیں“



مت مرؤمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سوید اے دل چشم میں آہیں

برشکالِ گریہ عاشق ہے، دیکھا چاہئے  
رکھل گئی مانند گل سوجا سے دیوارِ چمن  
الفِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی  
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں  
سلطنت دست بدست آئی ہے جامِ عے خاتمِ جمشید نہیں  
ہے تھکی تری سامانِ وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں  
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں  
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومی جاوید نہیں  
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں





جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں  
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

دل آشفٹگاں، خالی گنجِ دہن کے  
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم  
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!  
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سُراغِ نالہ لے داغِ دل سے  
کہ شبِ روکا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالب!  
تماشاے اہلِ کرم دیکھتے ہیں





ملتی ہے خوے یار سے نارُ التہاب میں  
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں  
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں  
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں، آتا تھا دورِ جام  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکر وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے  
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں



میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے  
ڈالا ہے تم کو وہم نے، کس پیچ و تاب میں

میں، اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے  
جال نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا  
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ، دل میں تحس کے برابر جگہ نہ پائے!  
جس نالے سے شکاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے!  
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب! چھٹی شراب، پر اب بھی، کبھی کبھی  
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں





کل کے لئے، کر آج نہ حُست شراب میں  
یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند  
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع  
گر وہ صدا سہائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رُخسِ عمر، کہاں دیکھئے تھے  
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے  
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں تیج و تاب میں



اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے  
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس احساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُور پر وجودِ بحر  
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم ایک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی  
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود  
ہیں خواب میں ہنوز، جو بگے ہیں خواب میں

غالب! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست  
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوئے تراب میں





حیراں ہوں دل کو روؤں کہ بیٹوں جگر کو میں  
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں لوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے کھر کا نام لوں  
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار  
اے کاش! جانتا نہ ترے ربزر کو میں

ہے کیا جو گس کے باندھے، میری بلا ڈرے  
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے  
یہ جانتا اگر، تو لکاتا نہ کھر کو میں



چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ  
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار  
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار  
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا  
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمدِ ناز  
دیکھوں علی بہادرِ عالی گھر کو میں





ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں  
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدہ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق!  
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاید ہستی مطلق کی کر ہے عالم  
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن  
ہم کو تقلید تک ظرفی منظور نہیں



حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی  
حق پڑ غریبہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں  
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ”ہم حور نہیں“

ظلم کو ظلم، اگر لطفِ درخ آتا ہو  
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُروی کش پیا نہ جم ہیں ہم لوگ  
وایے! وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب  
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ ”مشہور نہیں“





نالہ جو حُسنِ طلبِ اے ستم ایجاد! نہیں  
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرتگاہِ خسرو، کیا خوب!  
ہم کو تسلیم نکلونامی فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، یہ وسعت معلوم  
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گریاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب  
لطمۂ موجِ کم از سلی استاد نہیں



وای! محرومی تسلیم و بدا! حالِ وفا  
جاننا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکین گلِ ولالہ، پریشاں کیوں ہے  
گر چراغانِ سرِ رہزیرِ باد نہیں

سید گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں  
مژدہ، اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات ترا و ش، گویا  
دی ہی جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں، جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت  
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب!  
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں!





دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا  
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے  
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں!

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہل بزم!  
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں!



ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر  
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں



قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا  
تعجب سے وہ بولا، ”یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!“  
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب!  
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں





دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا  
بارے، اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں  
ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام  
مہر گردوں ہے، چراغِ رہزارِ بادیاں



یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں  
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!  
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں، اُس کے دست و بازو کو  
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!

ترے جواہرِ طرفِ گلہ کو کیا دیکھیں!  
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں





نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں  
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے  
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجبا نہ کہیں  
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں  
کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں!“

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب  
گدائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام  
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب!  
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ ”یاد نہیں“





تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں  
 آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے! ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں  
 تیری فرصت کے مقابل اے عمر! برق کو پا بہ جتا باندھتے ہیں  
 قیدِ ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں  
 نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں  
 غلطی ہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں  
 اہل تدبیر کی واماندگیاں! آبلوں پر بھی جتا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خواباں غالب!

ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں



زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد

وگر نہ ہم تو توقعِ زیادہ رکھتے ہیں





دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں  
 خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں  
 کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل  
 انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں  
 یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟  
 لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں  
 حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے  
 آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں  
 کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟  
 لعل و زُمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں  
 رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ!  
 رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں  
 کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے!  
 کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں  
 غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا  
 وہ دن گئے جو کہتے تھے، ”تو کر نہیں ہوں میں“





سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں  
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بناتِ انعش گردوں دن کو پردے میں نہاں  
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں، یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر  
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پرزنانِ مصر سے  
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کعبان ہو گئیں



جُوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق  
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پر یزادوں سے لیں گے حُلد میں ہم انتقام  
قدرتِ حق ملے یہی، حوریں، اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں گھل گیا  
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار  
جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے  
میری آہیں، بخیر چاکِ گریباں ہو گئیں



واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب!  
یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرف درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا  
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم  
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خُگر ہوا انسان، تو مٹ جاتا ہے رنج  
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب، تو اے اہلِ جہاں!  
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں





دیوانگی سے، دوش پہ زُتار بھی نہیں  
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے  
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے  
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں  
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں



شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر و بالِ دوش  
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیارِ یک طرف  
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہاے زار سے میرے خدا کو مان  
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مڑگاں سے رُکشی  
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اسِ سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!  
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا  
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں





نہیں ہے زخم کوئی، بچنے کے درخور مرے تن میں  
 ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں  
 ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی  
 کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں  
 ودیعت خانہ بیدارِ کاوش ہائے مڑگاں ہوں  
 نگین نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں، تن میں  
 بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی  
 شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں  
 نکوہش، مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی  
 ہوا ہے خندہ احباب، بخیہ جیب و دامن میں  
 ہوئے اُس مہروش کے جلوہ تمثال کے آگے  
 پر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں  
 نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے  
 جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں  
 ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو  
 سیہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں  
 اسدا! زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں  
 خیمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے، طوقِ گردن میں





مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں  
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہو اڑالے جائے  
وگر نہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشتِ شمال کی آمد آمد ہے!  
کہ غیر جلوۂ گل رہزور میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا  
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش  
شرانجانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ  
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد!  
گھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں





دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں!  
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں  
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں!

جب وہ جمال و فروز، صورتِ مہر نیم روز  
آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پردے میں منہ مچھپائے کیوں!

دشنہِ عمرہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ  
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں!



قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں  
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

حُسن اور اُس پہ حُسن ظن، رہ گئی بوالہوش کی شرم  
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع  
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بکائے کیوں!

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی  
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں!

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!  
روئے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں!





غنیٰ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ ”یوں“  
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ ”یوں“

”پیش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ دن کہے  
 اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ ”یوں“

رات کے وقت نئے پے، ساتھ رقیب کو لئے  
 آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے  
 سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں



بزم میں اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھیے  
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی“  
سُن کے، ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ”یوں؟“

مجھ سے کہا جو یار نے، ”جاتے ہیں ہوش کس طرح؟“  
دیکھ کے میری بخودی چلنے لگی ہوا کہ ”یوں“

کب مجھے گوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی  
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال  
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ ”یوں“

جو یہ کہے کہ ”ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟“  
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ ”یوں“



و

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو  
 کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو  
 بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی  
 بھروں یک گوشہ دامن گر آبِ مفت دریا ہو  
 اگر وہ سرو قد، گرم خرامِ ناز آ جاوے  
 کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ ثمری نالہ فرسا ہو

○

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں  
 بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو!  
 طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبین کی لاگ  
 دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو  
 ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے  
 بیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو  
 غالب! کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے  
 خرمنِ جلے، اگر نہ ملکِ کھائے کشت کو





وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو  
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا  
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلہ  
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر درد کی دوا  
یوں ہو تو چارہ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو



ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ  
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال  
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ زبونی ہمت، ہے انفعال  
حاصل نہ کیجئے دہرے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارنگی بہانہ بیگانگی نہیں  
اپنے سے کر نہ غیرے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

بٹکا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی  
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدا!  
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!





قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو  
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے  
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اُس جراحت پر  
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مرگان سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں  
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں  
نہیں دیکھا مشاور جوے خون میں تیرے تو سن کو



ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا  
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے  
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے  
مرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں، جودی تھی یہ تُو مجھ کو  
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لکنا دن کو، تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا  
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

خن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جو یا ہوں جواہر کے  
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھو دیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب!  
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو





دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو  
 رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو  
 دی سادگی سے جان، پڑوں کو ہلن کے پانو  
 ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو  
 بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ  
 ہو کر اسیر، دابتے ہیں، راہزن کے پانو  
 مرہم کی جستجو میں، بھرا ہوں جو دور دور  
 تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو  
 اللہ رے ذوقِ دشت نور دی کہ، بعدِ مرگ  
 ملتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پانو  
 ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف  
 اڑتے ہوئے اُبلتے ہیں مرغِ چمن کے پانو  
 شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں!  
 دُکھتے ہیں آج، اُس بُتِ نازک بدن کے پانو  
 غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو  
 پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پانو





واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار  
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ  
آئینہ تاکہ دیدۂ نچیر سے نہ ہو



واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو  
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو  
دل کو میں اور مجھے دلِ محوِ وفا رکھتا ہے  
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو  
ضعف سے، نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن  
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو  
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو



یہ نگاہ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو  
 رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں  
 نالہٴ مُرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو  
 سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا  
 ہنس کے بولے کہ ”ترے سر کی قسم ہے ہم کو“  
 دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ! ولیکن ناچار  
 پاسِ بے روقی دیدہ، اہم ہے ہم کو  
 تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو  
 ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

### قطعہ

لکھنو آنے کا باعث نہیں گھلتا، یعنی  
 ہوں سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو  
 مقطعِ سلسلہٴ شوق نہیں ہے یہ شہر  
 عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو  
 لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب!  
 جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو





تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو  
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے  
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگناہ کش و حق ناشناس ہیں؟  
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار  
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ مٹھتا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید  
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست  
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گرنے ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں  
دُنیا ہو، یا رب! اور میرا بادشاہ ہو





گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہوا!  
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہوا!

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال  
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہوا!

ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے  
حیا ہے اور یہی گو گو، تو کیوں کر ہوا!

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا  
بچوں کی ہو اگر ایسی ہی ہو تو کیوں کر ہوا!



اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ  
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہوا!

جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا  
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہوا!

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر  
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہوا!

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا  
نہ مانے دیدہ دیدار جو، تو کیوں کر ہوا!

بتاؤ، اُس مژدہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار  
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہوا!

مجھے جنوں نہیں، غالب! ولے بقولِ حضور  
”فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہوا!“





کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہوا!  
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہوا!

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں  
سُک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ”ہم سے سرگراں کیوں ہوا“

کیا غمخوار نے رُسا، لگے آگ اس محبت کو  
نہ لادے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہوا!

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا  
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستان کیوں ہوا!

قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہدم!  
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہوا!



نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب  
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہوا!





رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو  
 ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو  
 بے در و دیوار سا، اک گھر بنایا چاہیے  
 کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو  
 پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار  
 اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو



از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ  
 طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ



ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ نمکدہ  
 جس کی بہاریہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ  
 ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے  
 دُشواری رہ و ستم ہمراہاں نہ پوچھ



ی

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے جو مرگاں اٹھائیے  
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق  
یعنی ہنوز منتِ طفلان اٹھائیے

دیوارِ بارِ منتِ مزدور سے ہے خم  
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجئے  
یا پردہِ تبسمِ پنہاں اٹھائیے





مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے  
 عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر  
 آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے  
 دے داداے فلک! دل حسرت پرست کی  
 ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے  
 سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری  
 تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے  
 نئے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو  
 اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے  
 ہے رنگِ لالہ و گل و نرسِ جدا جدا  
 بہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے  
 سرِ پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی  
 رُو، سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے  
 یعنی بہ حسب گردشِ پیانہ صفات  
 عارف ہمیشہ مستِ نئے ذات چاہیے  
 نشوونما ہے اصل سے، غالب! فروع کو  
 خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے





بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی  
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزرده ہم چندے، تکلف سے  
تکلف برطرف، تھا یک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکینِ دلِ آزرده کو بخشنے  
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمد!   
کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردِ دُروں وہ بھی

نہ اتنا بڑشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ   
مرے دریا سے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مے عشرت کی خواہشِ ساقی گردوں سے کیا کیجئے   
لیے بیٹھا ہے اک دوچار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں   
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی





ہے بزمِ بیاں میں سخنِ آزرده لبوں سے  
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدحِ وجہِ پریشانی صہبا  
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہدا  
زنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے

بیدارِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر  
ہر چند مری جان کو تھا ربطِ لبوں سے



تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا  
سُن لیتے ہیں، گو ذکرِ ہمارا نہیں کرتے  
غالب! ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو  
وہ سُن کے نکلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے





گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا  
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے



غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی  
فلک کا دیکھنا، تقریبِ تیرے یاد آنے کی

ٹکھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا، یارب!  
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے  
دلے مشکل ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چھپانے کی



اُنہیں منظور اپنے زخموں کا دیکھ آنا تھا  
اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا  
ترا آنا، نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی

لکد کوہِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی  
مری طاقت، کہ ضامن تھی بچوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابنائے زماں غالب!  
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہائیکی



حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی!  
دلِ جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی  
اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے  
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی





کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے  
 جس میں کہ ایک بیضہ موزِ آسمان ہے  
 ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے  
 پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے  
 حال آنکہ ہے یہ سبلی خارِ اسے لالہ رنگ  
 غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے  
 کی اُس نے گرم سینہ اہلِ ہوس میں جا  
 آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے  
 کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟  
 بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے  
 بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوارِ یار میں  
 فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے  
 ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا  
 کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے  
 ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر  
 غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے





درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے!  
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ  
تو نے پھر کیوں کی تھی سیری غمگساری ہائے ہائے!

کیوں مری غمخواری کا تجھ کو آیا تھا خیال؟  
دُشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے!

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا!  
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی  
یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے ہائے!

گلِ فشانِی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟  
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!



شرم رسوائی ہے، جا چھپنا نقابِ خاک میں  
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہاے ہاے!

خاک میں ناموسِ پیانِ محبتِ بل گئی  
اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہاے ہاے!

ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا  
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہاے ہاے!

کس طرح کاٹے کوئی شب ہاے تارِ برشگال  
ہے نظرِ خو کردہ اخترِ شماری ہاے ہاے!

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال  
ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری ہاے ہاے!

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب! ابھی وحشت کا رنگ  
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہاے ہاے!





سرگشتگی میں، عالم ہستی سے پاس ہے  
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر  
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجئے بیاں سرورِ تب غم کہاں تلک  
ہر مومرے بدن پہ زبانِ پاس ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانہ وفا  
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب  
اسِ بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرفِ اسدا  
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگلِ اداس ہے





گر خامشی سے فائدہ اخفا سے حال ہے  
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ  
دلِ فردِ جمع و خرجِ زباں ہاے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرواز، اے خدا!  
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی!  
اے شوق! منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان  
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا  
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدا!  
عالمِ تمامِ حلقہٴ دامِ خیال ہے





تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو  
 حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے  
 ولا! یہ درد و الم بھی تو مُغتنم ہے، کہ آخر  
 نہ گریہ سحری ہے، نہ آہ نیم شعی ہے



ایک جا حرفِ وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا  
 ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے  
 جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر، نہ کیوں!  
 ہم نہیں جلتے، نفسِ ہر چند آتش بار ہے  
 آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا  
 ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے  
 ہے وہی بدستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ  
 جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے  
 مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی  
 زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے  
 آنکھ کی تصویر سرنا سے پہ کھینچی ہے، کہ تا  
 تجھ پہ گھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے





پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے  
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے



مری ہستی، فضائے حیرت آباد تمنا ہے  
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو  
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفاے دلبراں ہے اتفاقی، ورثہ اے ہمد!  
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے!

نہ لائی شوخی اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی  
کفِ افسوس ملتا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے





رحم کر، ظالم! کہ کیا بود چراغِ کُشتہ ہے  
نبضِ بیمار وفا، دودِ چراغِ کُشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں  
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کُشتہ ہے



چشمِ خواباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے  
سُرمہ، تو کہوے کہ دودِ شعلہٗ آواز ہے

ہیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے  
نالہ، گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دستِ گاہِ دیدہ کونبارِ مجنوں دیکھنا  
یک بیاباں جلوہٗ گل، فرشِ پا انداز ہے





عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی  
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجئے نہ، تعلق ہم سے  
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں، ہے کیا رسوائی؟  
اے، وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!  
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی



اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو  
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ حزام  
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!  
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ نا انصاف!  
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے  
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدا!  
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی





ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے  
صبحِ وطن ہے خندہ دندان نما مجھے

ڈھونڈے ہے اُس مُغنی آتشِ نفسِ کوجی  
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال  
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

بکرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں  
آنے لگی ہے نکبتِ گل سے حیا مجھے

گھٹنا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ!  
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے





زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب!  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے



اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے  
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا  
میں، اور جاؤں دُر سے ترے دن صدا کیے!

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے  
مدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر  
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے!



مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!  
تو نے وہ گنج ہائے گرانما یہ کیا کیے؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدد  
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں، یہ تُو  
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات، مگر تُو بُری نہیں  
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب! تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا  
مانا کہ تم کہا کیے، اور وہ سنا کیے





رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے  
اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے

میناے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے  
بالِ تدر، جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا  
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے

جادوِ بادہ نوشی، رنداں ہے ششِ جہت  
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو، اُس برقِ حُسن کا  
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامرآؤ دل کی تسلی کو کیا کروں  
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہِ کامیاب ہے

گزرا اسدا مسرتِ پیغامِ یار سے  
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے





دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے  
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے  
آگینہ بندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب، وہ کیونکر منع گستاخی کرے  
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ کت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے  
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے



دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے واہ واہ!  
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق  
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزمِ آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں  
مثلِ نقشِ مدعاے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا  
رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مَصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!  
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دُور بھاگے ہے اسدا!  
پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!





گرم فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے  
تب اماں ہجر میں دی، بردلیانی نے مجھے  
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت، معلوم!  
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے  
کثرتِ آرائی وحدت ہے پرستاری وہم  
کر دیا کافرِ ان اصنامِ خیالی نے مجھے  
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا  
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے



کار گاہِ ہستی لالہ داغِ ساماں ہے  
برقِ خرمینِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے  
غنیچہٗ تاشکفتن ہا برگِ عافیت معلوم  
باوجودِ دُجبعی، خوابِ گل پریشاں ہے  
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے!  
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہٗ خس بہ دندان ہے



اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہٗ غالب!  
ہم بیابان میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے





سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے  
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ  
ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائے گی  
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

رنج رہ کیوں کھینچے، واماندگی کو عشق ہے  
اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی  
فتنہ شورِ قیامت، کس کی آب و گل میں ہے؟

ہے دلِ شوریدہ غالبِ طلسمِ جیج و تاب  
رحم کر اپنی تمنا پر کہ، کس مشکل میں ہے





دل سے جری نگاہ، جگر تک اُتر گئی  
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ!  
تکلیفِ پردہ داری زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں!  
اُٹھے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری گوتے یار میں  
بارے اب اے ہوا! ہوں بال و پر گئی



دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا  
موجِ خرامِ یار بھی، کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسنِ پرستی شعار کی  
اب آبروے شیوہ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا  
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا ودی کا تفرقہ یک بارمٹ گیا  
کل تم گئے کہ، ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمہیں  
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟





تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظرِ ملے  
حورانِ خلد میں تری صورت گر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل  
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم  
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!  
میرا سلام کہو، اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا  
فرصت کشاکشِ غم پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں  
مانا کہ اک یوزگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچہ دلدار! دیکھنا  
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے





کوئی دن، گر زندگانی اور ہے  
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتش دوزخ میں یہ گرمی، کہاں  
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں  
پر کچھ اب کے سرگرمی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر  
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاصدِ اعمار ہیں اکثر فحوم  
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں، غالب! بلائیں سب تمام  
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے





کوئی اُمید بر نہیں آتی      کوئی صورت نظر نہیں آتا  
 موت کا ایک دن مُعین ہے      نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟  
 آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی      اب کسی بات پر نہیں آتی  
 جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد      پر طبیعت ادھر نہیں آتی  
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں      ورنہ کیا بات کر نہیں آتی  
 کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں      میری آواز گر نہیں آتی  
 داغِ دل گر نظر نہیں آتا      یو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟  
 ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی      کچھ ہماری خبر نہیں آتی  
 مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی      موت آتی ہے پر نہیں آتی  
 کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب!       
 شرم تم کو مگر نہیں آتی!





دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟  
ہم ہیں مشتاق، اور وہ بیزار  
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟  
یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے؟  
کاش پوچھو کہ ”مَدِّعَا کیا ہے؟“

## ق

جب کہ تجھ دن نہیں کوئی موجود  
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟  
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟  
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟  
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید  
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہو گا  
جان تم پر نثار کرتا ہوں

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے  
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟  
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟  
اُبَر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے  
اور درویش کی صدا کیا ہے  
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب!  
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے





کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ عالیہ مُو آئے  
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کش مکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت!  
کچھ کہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم  
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین  
ہاں منہ سے مگر بادۂ دو شینہ کی مُو آئے



جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے  
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہل طلب! کون سُنے طعنہ نایافت  
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں  
اُس دَر پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گرِ یہ میں تقریر  
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب!  
ہم بھی گئے واں، اور تری، تقدیر کو رو آئے





پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے  
پھر جگر کھودنے لگا ناخن  
قبلہ مقصد نگاہ نیاز  
چشم دلال جس رسوائی  
وہی، صد رنگ نالہ فرسائی  
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر  
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے  
پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں  
سینہ جویاے زخمِ کاری ہے  
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے  
پھر وہی پردہ عماری ہے  
دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے  
وہی، صد گونہ اشکباری ہے  
محشرِ ستانِ بیقراری ہے  
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے  
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر گھلا ہے درِ عدالتِ ناز  
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر  
پھر دیا پارہ جگر نے سوال  
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشقِ طلب  
دل و مرگاہ کا جو مقدمہ تھا  
گرم بازارِ فوجداری ہے  
زُلف کی پھر سرشتِ داری ہے  
ایک فریاد و آہ و زاری ہے  
اشکباری کا حکم جاری ہے  
آج پھر اُس کی روبکاری ہے  
بیخودی، بے سبب نہیں، غالب!  
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے





بچوں تہمت کش تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی  
 نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی  
 کشاکشِ ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی  
 ہوئی زنجیر، موجِ آبِ کو، فرصتِ روانی کی  
 پس از مُردن بھی دیوانہ زیارتِ گاہِ طفلان ہے  
 شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلِ فشانی کی



نکلوش ہے سزا، فریادی بیدارِ دلبر کی  
 مبادا خندہ دندانِ نما ہو صبحِ محشر کی!  
 رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے  
 اگر بودے بجائے دانہ، دہقاں نوکِ نشتر کی  
 پر وانی شاید بادبانِ کشتی سے تھا  
 ہوئی مجلس کی گرمی سے روانیِ دورِ ساغر کی  
 کروں بیدارِ ذوقِ پرفشانیِ عرض، کیا قدرت!  
 کہ طاقت اڑ گئی، اڑنے سے پہلے میرے شہر کی  
 کہاں تک رُوؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے  
 مری قسمت میں، یارب! کیا نہ تھی دیوارِ پتھر کی؟





بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے  
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے

پہاں تھا دامِ سخت، قریب آشیان کے  
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری، اپنی فتا پر دلیل ہے  
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!  
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے



تیری وفا سے کیا ہو تلافی، کہ دہر میں  
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں  
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تنہی خوا! جس کے بیم سے  
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق  
جو پانو اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے  
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدا! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی  
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے





جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی  
تو فردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی  
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی  
کبھی کود کی میں جس نے نہ سنی مری کہانی  
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا  
کہ ”برے عدد کو، یارب! ملے میری زندگانی“



ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے  
اک شمع ہے دلیلیِ سحر، سو محوش ہے  
نے مژدہ وصال، نہ نظارۂ جہان  
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے  
نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب  
اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے  
گوہر کو عقدِ گردنِ خواباں میں دیکھنا!  
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے



دیدارِ بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہِ مست  
بزمِ خیالِ میکدہ بے خروش ہے



اے تازہ وارِ دامنِ بساطِ ہوائے دل!  
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے  
دیکھو مجھے جو دیدہِ عبرتِ نگاہ ہو  
میری سُنو، جو گوشِ نصیحتِ نیوش ہے  
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی  
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے  
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہِ بساط  
دامنِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے  
نطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ  
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے  
یا صبحِ دم جو دیکھیے آ کر، تو بزمِ میں  
نے وہ سرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے  
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی  
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے  
آتے ہیں غیب سے یہ مضامینِ خیال میں  
غالب! صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے





آکھ مری جان کو قرار نہیں ہے  
طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے  
نقشہ بہ اندازہٴ ثمار نہیں ہے

گر یہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو  
ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر  
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی  
غیرِ گلِ آئینہ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے  
وائے، اگر عہدِ استوار نہیں ہے

تو نے قمے کشی کی کھائی ہے غالب!  
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے





ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے  
 کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے  
 رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی  
 سمجھو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے  
 وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب  
 چٹکنا غنچہ گل کا، صدائے خندہ دل ہے



پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد  
 خارِ پا ہیں جو ہر آئینہ زانو مجھے  
 دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت  
 ہے نگاہِ آشنا، تیرا سر ہر مو مجھے  
 ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ  
 ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے





جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے  
جاں، کالبہ صورتِ دیوار میں آوے

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر  
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مانگی اشک بجا ہے  
جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!  
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسون گر کا اگر پائے اشارہ  
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے



کانٹوں کی زباں سُکھ گئی پیاس سے یارب!  
اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک  
آغوشِ خمِ حلقہ زُتار میں آوے

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوں زر  
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلیِ ناداں!  
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے  
اے واے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

سُنجیدہ معنی کا ظلم اس کو سمجھیے  
جو لفظ کہ غالب! مرے اشعار میں آوے





حُسنِ مہر، گرچہ بہ ہنگامِ کمالِ اچھا ہے  
اُس سے میرا مہِ عُرشیدِ جمالِ اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں، اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ  
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مالِ اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا  
سافرِ جسم سے مرا جامِ سفالِ اچھا ہے

بے غلبت دین، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے  
وہ کدوا، جس کو نہ ہو کھوے سوالِ اچھا ہے



اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق  
وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بچوں سے کیا فیض!  
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا  
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے، تو دریا ہو جائے  
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز  
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے، بخت کی حقیقت، لیکن  
دل کے خوش رکھنے کو غالب! یہ خیال اچھا ہے





نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی  
امتحان اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے  
شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے  
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا  
گر نہیں شمعِ سیہ خانہ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق  
نوحہ غم ہی سہی، نعمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا  
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خواباں ہی غنیمت سمجھو  
نہ ہوئی، غالب! اگر عمرِ طبعی، نہ سہی





عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے  
کہ اپنے سایے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا، خراب بادۂ اُلفت  
فقط ”خراب“ لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی  
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے دادِ اس بخونِ شوق کی دنیا  
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے  
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم! آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجِ خوں ہے  
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسمِ جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب!  
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے





شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے  
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

مُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا  
اک زرا چھیڑیے پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو  
شکوہِ جور سے، سرگرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکو کب کی وہ چال  
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم  
آپ اٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ  
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے



نالہ جاتا تھا، پرے عرش سے میرا اور اب  
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

### قطعہ

خامہ میرا، کہ وہ ہے بارِ بدِ بزمِ سخن  
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے!

اے شہنشاہِ کواکب سو مہرِ علم!  
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے  
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال  
آستاراں پر ترے مہمہ ناصر سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں  
یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ فزا ہوتا ہے

رکھو غالب! مجھے اس تلخِ نوائی میں معاف  
آج کچھ دردِ میرے دل میں سوا ہوتا ہے





ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ”تو کیا ہے؟“  
تمہیں کہو کہ ”یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟“

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا  
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ بندہ تو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے  
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن  
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے



جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا  
گریدتے ہو جو آبِ راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے، ہم نہیں قاتل  
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز، جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز  
سوائے بادۂ گلفام مشکو، کیا ہے!

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار  
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی  
تو کس امید پہ کہے کہ آرزو کیا ہے!

ہوا ہے شبہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا  
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے





میں اُنہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں  
چل نکلتے، جو مے پے ہوئے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو  
کاش کے، تم مرے لئے ہوتے!

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا  
دل بھی یا رب! کئی دیے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر، غالب!  
کوئی دن اور بھی جیسے ہوتے





غیر لیں محفل میں، بو سے جام کے  
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تُم سے کیا شکوہ، کہ یہ  
ہتکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو  
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ پئے، اور صبح دم  
دھوئے دھبے جامہٴ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر  
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے؟

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر  
دیکھیے، کب دن پھریں حمام کے!

عشق نے غالب! نکلتا کر دیا  
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے





پھر اس انداز سے بہار آئی      کہ ہوئے مہر و مہ تماشا  
 دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک!      اس کو کہتے ہیں عالم آرائی  
 کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر      رُو کشِ سطحِ چرخِ مینائی  
 سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی      بن گیا رُوئے آپ پر کائی  
 سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے      چشمِ زگس کو دی ہے مینائی  
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر      بادہ نوشی ہے بادِ پیائی  
 کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالب!      شاہِ دیندار نے شفا پائی



تغافل دوست ہوں، میرا دماغ عجزِ عالی ہے  
 اگر پہلو تہی کیجئے، تو جا میری بھی خالی ہے  
 رہا آبادِ عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے  
 بھرے ہیں جس قدر جامِ وسو، میخانہ خالی ہے





کب وہ سُنتا ہے کہانی میری  
 خلشِ غمزہ خوں ریز نہ پوچھا!  
 کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار  
 ہوں زخود رفتہ بید اے خیال  
 متقابل ہے، مقابل میرا  
 قدرِ سنگِ سر رہ رکھتا ہوں  
 گردِ بادِ رہ بیتابی ہوں  
 وہنِ اُس کا جو نہ معلوم ہوا  
 اور پھر وہ بھی زبانی میری  
 دیکھ خونا بہ نشانی میری  
 مگر آشفٹہ بیانی میری  
 بھول جانا ہے نشانی میری  
 رُک گیا، دیکھ روانی میری  
 سخت ارزاں ہے گرانی میری  
 صرصرِ شوق ہے بانی میری  
 گھل گئی چچ مدانی میری  
 کر دیا صُف نے عاجز، غالب!  
 تنگ پیری ہے جوانی میری





نقشِ نازِ بُتِ طناز، بہ آغوشِ رقیب  
 پائے طاؤسِ پئےِ خامہٴ مانی مانگے  
 تو وہ بد خو کہ، تحیر کو تماشا جانے  
 غم وہ افسانہ کہ، آشفقۂ بیانی مانگے  
 وہ تب عشقِ تمنا ہے کہ، پھر صورتِ شمع  
 شعلہ تا نہیں جگر ریشہٴ دوانی مانگے



گلشنِ کوتری صحبت از بس کو خوش آئی ہے  
 ہر غنچے کا گل ہونا، آغوشِ سلجائی ہے  
 واں لکڑِ استغناء، ہر دم ہے بلندی پر  
 بیانِ نالے کو اور الٹا، دعوائے رسائی ہے  
 از بکرہٴ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے  
 جو داغِ نظر آیا، اک چشمِ نمائی ہے





جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی  
لکھ دیجیو یا رب! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور  
دل میں نظر آتی ہے اک بوندِ لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟  
یاں تو کوئی سُنا نہیں فریادِ رسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو  
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صدِ حیف وہ ناکام، کہ اک عمر سے 'غالب'!  
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی





سیماب، پُشت گرمی آئینہ دے ہے ہم  
حیراں کیے ہوئے ہیں دل بے قرار کے

آغوشِ گل کُشودہ برائے وداع ہے  
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں  
معتوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں  
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے





چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے  
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے خدر  
جائے، اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!  
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر، جیب، بے ایام گل  
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے



دوستی کا پردہ ہے بیگانگی  
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو  
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی  
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منہ مرنے پہ ہو جس کی امید  
ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل! ان مہہ طلعتوں کے واسطے  
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد  
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے





ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے  
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر  
ہے نگہِ رشتہ شیرازہِ مرگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں  
صورتِ دُود، رہا سایہِ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو، سادگیِ آموزِ بچاں  
کس قدر خانہِ آئینہ ہے ویراں مجھ سے



اڑ آبلہ سے، جادۂ صحراے بکوں  
صورتِ رشتہ گوہر سے چراغاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو!  
پڑے سایے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے  
ہونگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بیکسی ہاے شبِ ہجر کی وحشت ہے، ہے!  
سایہِ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے  
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نکۂ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے، اسد!  
ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے





نکتہ چیں ہے، غم دل اُس کو سنائے نہ بنے  
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبہ دل!  
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے  
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ، اگر  
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے



اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا  
ہاتھ آئیں، تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے  
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ دن آئے نہ رہے  
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بکائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے  
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتشِ غالب!  
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے





چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے  
صبح کے مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریجئے خیال  
دیدہ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نو میدِ یارب! کب تک  
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرا نجان کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ نازے پاوے شکست  
موے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد  
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے





وہ آ کے، خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے  
وے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاؤٹ میں تیرا رو دینا  
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کو ہم کر  
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اُوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے  
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے

اسدا! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے  
کہا جو اُس نے، ”زرا میرے پانو داب تو دے“





تپش سے میری، وقف کش مکش ہر تارِ بستر ہے  
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سر شکِ سر بہ صحرا دادہ، نوزِ العینِ دامن ہے  
دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو  
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی  
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بوبالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی  
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے

کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب!  
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے





خطر ہے، رشتہ اُلفتِ رگِ گردن نہ ہو جائے  
 غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جائے  
 سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما، غالب!  
 اگر گلِ سرو کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جائے



فریاد کی کوئی لے نہیں ہے  
 کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے؟  
 ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے  
 ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!  
 شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے  
 کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہدا!  
 نالہ پابند نے نہیں ہے  
 گر باغ گدائے نے نہیں ہے  
 پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے  
 ہر چند کہیں کہے نہیں ہے  
 اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے  
 نے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے  
 ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالب!  
 آخر تو کیا ہے، ”آے نہیں ے؟“



نہ پوچھ نسخہ مرہمِ جراحتِ دل کا  
 کہ اس میں ریزہ الماس جزوِ اعظم ہے  
 بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی  
 وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے





ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے  
 مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے  
 در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربط نہانی  
 ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے  
 یہ باعثِ نومیدی، اربابِ ہوس ہے  
 غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے



کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ  
 خطِ پیاہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے  
 کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے!  
 کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے  
 بجا ہے، گر نہ سنے، نالہ ہائے بلبلِ زار  
 کہ گوشِ گل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیاں ہے  
 اسد ہے نزع میں، چل بیوفا! برائے خدا!  
 مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکین ہے





کیوں نہ ہو چشمِ بٹیاں محو تغافل، کیوں نہ ہو؟  
 یعنی اس بیمار کو تظارے سے پرہیز ہے  
 مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی  
 واسے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے  
 ماری گل دیکھ، رُوے یار یاد آیا، اسدا!  
 جو ششِ فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے



دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے  
 ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے دن نہ رہے  
 قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے!

رہے ہیں گہرے گہرے کہ گہرے دوست کو اب  
 اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے؟



زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب  
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے!

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں، وہ پرسشِ حال  
کہ یہ کہے کہ، سرِ رہزور ہے کیا کہیے؟

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال  
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے!

انہیں سوال پہ زعمِ بجوں ہے کیوں لڑیے  
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے؟

حد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجئے  
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے!

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں، لیکن  
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کہیے





دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے  
 کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے  
 بن گیا تیغ نگاہیار کا سب فساں  
 مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے  
 کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جہم ہے  
 جانتا ہے محو پرش ہاے پنہانی مجھے  
 میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی  
 لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے  
 بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے!  
 اس قدر ذوق نوائے مرغ بُستانی مجھے  
 وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا  
 لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے  
 وعدہ آنے کا وفا کیجئے، یہ کیا انداز ہے؟  
 تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی درباری مجھے؟  
 ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!  
 پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزل خوانی مجھے  
 دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی  
 میزا یوسف ہے، غالب! یوسف ثانی مجھے





یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے  
سُحّہ زاہد ہوا ہے، خندہ زیر لب مجھے

ہے کشادِ خاطر وابستہ در، رہنِ سخن  
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانہ مکتب مجھے

یارب! اس آشفگی کی داد کس سے چاہیے!  
رشتہ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں!  
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے  
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے





حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے  
چمن میں خوش نوا یانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے  
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر  
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!  
اُسے یوسف کی ٹوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو نہ کہیو پھر کہ ”غافل تھے“  
غلیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے



رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو بہتر  
غرض شستِ بتِ ناوکِ فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُجھ و زُتار کے پھندے میں گیرائی  
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟  
مگر پھر تابِ زلفِ پُرِ شکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہوا!  
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب!  
نئے فتنوں میں اب چرخِ گہن کی آزمائش ہے





کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے  
 جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے  
 خدایا! جذبہٴ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!  
 کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کچھتا جائے ہے مجھ سے  
 وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی  
 عبارتِ مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے  
 ادھر وہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے  
 نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے  
 سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے!  
 کہ دامنِ خیالِ یار، مٹھوٹا جائے ہے مجھ سے  
 تکلفِ برطرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن  
 وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے  
 ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی  
 نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے  
 قیامت ہے کہ ہودے مدعی کا ہمسفر غالب!  
 وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!





زبسکہ مشق تماشا بجوں علامت ہے  
کشاد و بست مرہ، سلی ندامت ہے

نہ جانوں؛ کیونکہ مئے داغِ طعن بد عہدی  
تجھے کہ آئینہ میں بھی ورطہ ملامت ہے

بہ پیچ و تاب ہوں سلکِ عافیت مت توڑ  
نگاہِ عجز سرِ رشتہ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوای عشق بے بنیاد  
بجوں ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے!





لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے  
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم  
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوئے نہ دکھلاؤ پر بہ اندازِ عتاب  
کھول کر پردہ، زرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں  
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے





باز پچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے  
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے، اورنگِ سلیمان مرے نزدیک  
اک بات ہے اعجازِ میا مرے آگے

جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور  
جُز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں، صحرا مرے آگے  
گھستا ہے جبین خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے  
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟  
بیٹھا ہے بہت آئینہ سیما مرے آگے



پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار  
رکھ دے کوئی پیانہ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا  
کیوں کر کہوں، ”لو نام نہ اُن کا مرے آگے“

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر  
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام  
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پروصل میں یوں مر نہیں جاتے!  
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلم خونِ کاش! یہی ہو  
آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے  
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا  
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے؟





کہوں جو حال، تو کہتے ہو، ”مَدِّعَا کہیے“  
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے

نہ کہو طعن سے پھر تم، کہ ”تم ستمگر ہیں“  
مجھے تو خُو ہے، کہ جو کچھ کہو، ”بجا کہیے“

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے  
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

نہیں ذریعہٴ راحت، جراحتِ پیکاں  
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مَدِّعی بنے، اس کے نہ مَدِّعی بنے  
جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جان کا ہی مرض لکھیے  
کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے



کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے  
کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجئے  
کئے زبان، تو خنجر کو مرجا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو، نگار تو ہے  
روانی روش و مستی ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے  
طراوتِ چمن و خوبی ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب!  
خدا سے کیا ستم و جورِ نا خدا کہیے!





رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے  
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہاے مے ہوئے، آلاتِ میکشی  
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رُسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے، تم  
بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالہ بلبِل کو بے اثر؟  
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا!  
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ  
کی ایک ہی نگاہ کہ، بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسد کی نعش  
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے





نغمہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہامستِ طرب  
 شیشہٴ مے، سرِ سبز جویبارِ نغمہ ہے  
 ہم نشیں مت کہہ کہ ”برہم کرنے بزمِ عیشِ دوست“  
 واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے



حسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے  
 آئینہ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے  
 تاکجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باخشن؟  
 چشمِ وا گرویدہ، آغوشِ و داعِ جلوہ ہے





عرضِ نازِ خموشی دندان، برائے خندہ ہے  
دعویٰ جمعیتِ احبابِ جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل  
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

گلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام  
ورنہ دندان وہ دلِ افسردن بنائے خندہ ہے

سوزِ باطن کے ہیں احبابِ منکر ورنہ یاں  
دلِ محیطِ گریہ و لبِ آشنائے خندہ ہے





جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی  
مشکل کو تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سرِ بر  
کب تک خیالِ طرۂ لیلہ کرے کوئی

افسردگی نہیں طربِ انشائے التفات  
ہاں، دروین کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے  
آخر کبھی تو، عقدہٴ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے، جب رہِ پرش نہ وا ہوئی  
کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گل  
تاچند باغبانی صحرا کرے کوئی



ناکامی نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز  
تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہر شکست  
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سَرِ برِ ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر  
فرصت کہاں کہ، تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یاس خیر  
یہ درد وہ نہیں کہ، نہ پیدا کرے کوئی

بیکاری جُھوں کہ، ہے سرِ پیٹنے کا شغل  
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سخنِ دُور ہے، اسدا  
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی





ابن مریم ہوا کرے کوئی      میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی  
 شرع و آئین پر مدار سہی      ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟  
 چال، جیسے کڑی کمان کا تیر      دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!  
 بات پر واں زبان کٹتی ہے      وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی  
 بگ رہا ہوں بچوں میں کیا کیا کچھ!      کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی  
 نہ سُو، گر بُرا کہے کوئی      نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی  
 روک لو، گر غلط چلے کوئی      بخش دو، گر خطا کرے کوئی  
 کون ہے، جو نہیں ہے حاجتمند؟      کس کی حاجت روا کرے کوئی  
 کیا کیا خضر نے سکندر سے!      اب کسے رہنما کرے کوئی؟

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب!  
 کیوں کسی کا گلا کرے کوئی؟





بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے!  
غلام ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے!

تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم کیا ہے  
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟

کٹے، تو شب کہیں؛ کالے، تو سانپ کہلا دے  
کوئی بتاؤ کہ، وہ زلفِ خمِ بخم کیا ہے؟

لکھا کرے کوئی، احکامِ طالعِ مولود  
کسے خبر ہے کہ، دھاں حبشِ قلم کیا ہے!

نہ خشر و نشر کا قاتل، نہ کیش و ملت کا  
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانما پہ شرط ہے، ہمد!  
وگر نہ مہر سلیمان و جام و جم کیا ہے!

خن میں خامہ غالب کی آتش افشانی  
یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے





باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے  
سایہ شاخ گل، انہی نظر آتا ہے مجھے

جوہر تیغ بہ سر چشمہ دیگر معلوم  
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

مذعاً محو تماشاے شکستِ دل ہے  
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ، سرمایہ یک عالم و عالم، کفِ خاک  
آسمان بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے  
دیکھوں، اے مر گئے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے؟





روندی ہوئی ہے کو کبہ شہر یار کی  
 اترائے کیوں نہ خاک سر رہزار کی  
 جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ  
 لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی  
 بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے  
 کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی



کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے  
 بے تکلف، اے شرارِ جتہ! کیا ہو جائیے  
 بیضہ آسا ننگ بال و پر پہ ہے کنجِ قفس  
 از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے





ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے  
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہے گا اُس کی گردن پر  
وہ خون، جو چشمِ ترے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سُننے آئے ہیں، لیکن  
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا  
اگر اُس طرزہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے



مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے  
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی  
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع، خستگی کی داد پانے کی  
وہ ہم سے بھی زیادہ حسدِ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا  
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کا فر پہ دم، نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ، غالب! اور کہاں واعظ!  
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے





مستی بہ ذوقِ غفلت ساقی ہلاک ہے  
 موجِ شراب، یک مژہ خوابِ ناک ہے  
 جو زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو  
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے  
 جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدا  
 صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے



لبِ عیسیٰ کی جُتیش، کرتی ہے گہوارہ جُعبانی  
 قیامت، کُشیہ لعلِ بُناں کا خوابِ سنگیں ہے



آمدِ سیلابِ طوفانِ صداے آب ہے  
 نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنکی جادہ سے  
 بزمِ مے، وحشتِ کدہ ہے، کس کی چشمِ مست کا؟  
 شیشہ میں بھڑ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے





ہوں میں بھی تماشا ئی نیرنگ تمنا  
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بڑا دے



سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کاغذ پر  
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی



ہجومِ نالہ حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے  
خموشی ریشہ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے  
تکلف برطرف، ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں  
نگاہ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ غریاں ہے  
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی  
کہ صبحِ عید، مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے  
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا ہے  
غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو  
چراغِ روشن اپنا، قلمِ صرصر کا مرجاں ہے





خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے  
 نگاہِ دل سے ترے، سرمہ سا نکلتی ہے  
 فشارِ تنگی، خلوت سے بنتی ہے شبِ بنم  
 صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے  
 نہ پوچھ سینہ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ  
 کہ زخمِ روزِ در سے ہوا نکلتی ہے



جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے  
 نافہ، دماغِ آہوے دشتِ تار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!  
 آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق  
 گردِ ام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکا ہے



دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ  
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبِ نیم آئینہ برگِ گل پر آب  
اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے

سچ آ پڑی ہے وعدہٴ دلدار کی مجھے  
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر  
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب! یک کفِ خس بہرِ آشیاں  
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیری ہی سہی  
اے بے دماغ! آئینہٴ تمثالِ دار ہے

غفلتِ کفیلِ عمر و اسدِ ضامنِ نشاط  
اے مرگِ ناگہان! تجھے کیا انتظار ہے





آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے  
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں  
گلدستہ نگاہ، سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا!  
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر، ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے  
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں  
شوقِ عنان کسینہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے، شکفتنِ گلہائے عیش کو  
صبحِ بہار، پنبہ مینا کہیں جسے

غالب! بُرا نہ مان، جو واعظِ بُرا کہے  
ایسا بھی کوئی ہے کہ، سب اچھا کہیں جسے؟





شبم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زادا ہے  
داغِ دل بیدرو، نظر گاہِ حیا ہے

دل خوں عُدہٗ کش مکشِ حسرتِ دیدار  
آئینہ بدستِ بُتِ بدستِ حنا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی  
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے؟

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصدِ ذوق  
آئینہ بہ اندازِ گل، آغوشِ کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبلِ قفسِ رنگ  
اے نالہ، نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟



خونے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو  
معتوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوای گرفتاری اُلفت  
دستِ تیرے سنگِ آمدہ، پیمان وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ  
تیغِ ستم، آئینہٴ تصویرِ نما ہے

اے پر تو خُرشیدِ جہانتاب! ادھر بھی  
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد  
یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالب!  
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان! خدا ہے





منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی  
قسمت کھلتی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں  
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو  
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا  
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صُور کی



آمد بہار کی ہے، جو ٹبلبل ہے نغمہ سنج  
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں  
کعبہ سے ان بچوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ، سب کو ملے ایک سا جواب!  
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام ہیں، لیکن نہ اس قدر  
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالب! گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں  
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی





غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے  
 یہ رنج کہ کم ہے ہے گلفام بہت ہے  
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ  
 ہے یوں کہ مجھے دُرِ دہِ جام بہت ہے  
 نے تیرکماں میں ہے نہ صیاد کیں میں  
 گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے  
 کیا زہد کو مانوں کو نہ ہو گرچہ ریائی  
 پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے  
 ہیں اہلِ خرد، کس روشِ خاص پہ نازاں؟  
 پا بستگی رسم و رہِ عام بہت ہے  
 زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے  
 آلودہ بہ نئے جامۂ احرام بہت ہے  
 ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو  
 انکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے  
 خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!  
 رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
 ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے  
 شاعر تو وہ اچھا ہے یہ بدنام بہت ہے





مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے  
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو  
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم  
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس  
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق  
سلمانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے



پھر بھر رہا ہوں خامہٴ مرگاں بخونِ دل  
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب  
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ گوئے ملامت کو جائے ہے  
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب  
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال  
صدِ گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں، نامہٴ دلدار کھولنا  
جاں، نذرِ دل فریبیِ عنوان کیے ہوئے

مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوں  
زلفِ سیاہِ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے



چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو  
سُرمہ سے تیز دشنہ مرگاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تا کے ہے پھر، نگاہ  
چہرہ فروغِ نئے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں  
سرِ زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی، ڈھونڈھتا ہے پھر، وہی فرصت کہ رات دن  
بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے  
بیٹھے ہیں ہم جہیہ طوفاں کیے ہوئے





نوید امن ہے بیدارِ دوست جاں کے لئے  
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسمان کے لئے

بلا سے، گر مژہ یار تھنہ خوں ہے  
رکھوں کچھ اپنی بھی مرگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلقِ اے خضر!  
نہ تم کو چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلا سے آفتِ رشک  
بلاے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں  
دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر  
کرے قفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لئے



گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے  
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں طرفِ تنکناے غزل  
کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے  
بنا ہے عیشِ تجملِ حسینِ خان کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟  
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ مِلّت و مُلک  
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ ارایش  
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

وَرَقِ تمام ہوا، اور مدحِ باقی ہے  
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا  
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!



## منقبت میں

سازِ یک ذرّہ، نہیں فیضِ چمن سے بیکار  
 سایہ لالہ بیدار، سوید اے بہار  
 مستی بادِ صبا سے، ہے بہ عرضِ سبزہ  
 ریزہ شیشہ سے، جوہر تیغِ گھسار  
 سبز ہے، جامِ زمرد کی طرح، داغِ پلنگ  
 تازہ ہے، بیشِ نارنجِ صفت، روئے شرار  
 مستی ابر سے، گلچینِ طرب ہے، حسرت  
 کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار  
 کوہ و صحرا ہمہ معموری شوقِ بلبل  
 راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار  
 سوئے ہے فیضِ ہوا، صورتِ مرگانِ یتیم  
 سرنوشتِ دو جہاں ابر، بیکِ سطرِ غبار  
 کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال  
 قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار  
 کفِ ہر خاکِ بہ گردوں شدہ، قمری پرواز  
 دامِ ہر کاغذِ آتشِ زدہ، طاؤسِ شکار  
 میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی  
 بھول جا، یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار



موج گل ڈھونڈھ مخلو تكدہ غنچہ باغ  
 گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار  
 کھینچے گر مانی اندیشہ، چمن کی تصویر  
 سبز مثل خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار  
 لعل سی، کی ہے، پے زمزمہ مدحتِ شاہ  
 طوطی سبزہ کہسار نے پیدا منقار  
 وہ شہشاہ کہ، جس کی پے تعمیر سرا  
 چشمِ جبریل ہوئی قالبِ نشتِ دیوار  
 فلکِ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور  
 رشتہ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار  
 سبزہ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام  
 رفعتِ ہمتِ صد عارت و یک اوجِ حصار  
 واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پر کاہ  
 وہ رہے مروحہ بالِ پری سے بیزار  
 خاکِ صحراے نجف، جوہرِ سیرِ عرفاء  
 چشمِ نقشِ قدم، آئینہ بختِ بیدار  
 ذرہ اُس گرد کا، خورشید کو آئینہ ناز  
 گرد اُس دشت کی، اُمید کو، احرامِ بہار  
 آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز  
 عرضِ خمیازہ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار



## مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار!  
 دل پروانہ چراغاں، پر بلبِل گلزار  
 شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز  
 ذوق میں جلوے کے تیرے بہو اے دیدار  
 تیری اولاد کے غم سے ہے بُدوے گردوں  
 سلکِ اختر میں مہر نو، مہرِ گوہر بار  
 ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مہر نماز  
 ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار  
 مدح میں تیری نہاں، زمزمہٴ نعمتِ نبی  
 جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار  
 جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر  
 یک طرفِ نازشِ مرگان و دگر سو غمِ خار  
 مَر دُک سے ہو عزا خانہ اقبالِ نگاہ  
 خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئینہ دار  
 دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانہ دہر  
 عرضِ خمیازہٴ سیلاب ہو، طاقِ دیوار  
 دیدہ تا دلِ اسد، آئینہ یک پر تو شوق  
 فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار



## منقبت میں

دہر، مجھ جلوہ یکتائی معشوق نہیں  
 ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں  
 بیدی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق  
 بیکسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں  
 ہر زہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم  
 لغو ہے آئینہ فرقِ جنوں و تمکین  
 نقشِ معنی ہمہ، خمیازہ عرضِ صورت  
 سخنِ حق ہمہ، پیانہ ذوقِ تحسین  
 لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!  
 دُرِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں  
 مثلِ مضمونِ وفاء، باد بہ دستِ تسلیم  
 صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکین  
 عشق، بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس



وصل، زنگارِ رخ آئینہ حسنِ یقین  
 کوہکن، گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب  
 بے ستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں  
 کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟  
 کس نے پایا، اثرِ نالہِ دلہائے حزیں؟  
 سامعِ زمزمہِ اہلِ جہاں ہوں لیکن  
 نہ سروِ برگِ ستایش، نہ دماغِ نفیس  
 کس قدر ہر زہِ سرا ہوں کہ، عیاذاً باللہ!  
 یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکین  
 نقشِ لاحول، لکھ، اے خامہ ہذیاں تحریر!  
 ”یا علی“ عرض کر، اے فطرتِ وسواسِ قرین!  
 مظہرِ فیضِ خدا، جان و دل ختمِ رسل  
 قبلہ آلِ نبی، کعبہِ ایجادِ یقین  
 ہو، وہ سرمایہِ ایجاد، جہاں گرمِ خرام  
 ہر کفِ خاک، ہے واں، گردہِ تصویرِ زمیں  
 جلوہ پرواز ہو نقشِ قدمِ اُس کا، جس کا  
 وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں  
 نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے  
 ابدِ پشتِ فلک، خمِ شدہِ نازِ زمیں  
 فیضِ خلقِ اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا



بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگئیں  
 بڑشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا  
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہ ایجاد کہیں  
 کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے  
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بختانہ چیں  
 جاں پناہ! دل و جاں فیضِ رسانا! شاہا!  
 وحی ختمِ رسل تو ہے، بہ فتوای یقیں  
 جسمِ اطہر کو تے، دوشِ پیمبر، منبر  
 نامِ نامی کو ترے، ناصیہ عرش، نگین  
 کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟  
 شعلہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں  
 آستان پر ہے ترے جو ہر آئینہ سنگ  
 رقمِ بندگی حضرتِ جبریل امین  
 تیرے در کے لئے اسبابِ ثناء آمادہ  
 خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں  
 تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں  
 تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبین  
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا؟  
 کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں؟  
 جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد



کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں  
 شوخی عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب  
 ہے ترے حوصلہ فضل پر از بس کہ یقین  
 دے دعا کو مری، وہ مرتبہ حسن قبول  
 کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار، ”آمین“  
 غمِ شیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز  
 کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں  
 طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمی شوق  
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبین  
 دلِ الفتِ نسب و سینہ توحیدِ فضا  
 نگہ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں  
 صرف اعداء، اثرِ شعلہ دودِ دوزخ  
 وقفِ احباب، گل و سبیلِ فردوسِ بریں





جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام  
یہی انداز اور یہی اندام  
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام  
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام  
تجذاً اے نشاطِ عامِ عوام!  
لے کے آیا ہے عید کا پیغام  
صبح جو جائے اور آئے شام  
تیرا آغاز اور ترا انجام  
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام؟  
ایک ہی ہے امید گاہِ انام  
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟  
تب کہا ہے بطرزِ استفہام  
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام  
دو دن آیا ہے تو نظرِ دمِ صبح  
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟  
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا  
مرحبا، اے سرورِ خاصِ خواص!  
عذر میں تین دن نہ آنے کے  
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا  
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا  
رازِ دل مجھ سے کیوں پُچھتا ہے  
جانتا ہوں کہ، آج دنیا میں  
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہِ بگوش  
جانتا ہوں کہ، جانتا ہے تو  
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ



جو بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام  
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام  
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

تجھ کو کیا پایہِ روشناسی کا  
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو  
ماہِ بن، ماہِ تاب بن میں کون!



ار کے لین دین سے کیا کام  
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام  
کیا نہ دے گا مجھے نئے گلفام!  
کر چکے قطع تیری تیزی گام  
گوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام  
اپنی صورت کا اک بلوریں جام  
تو سن طبع چاہتا تھا لگام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے  
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص  
جو کہ بخشیکا تجھ کو فرِ فروغ  
جب کہ چودہ منازلِ فلکی  
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر  
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز  
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا

## غزل

تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام  
غم سے جب ہو گئی ہو زیستِ حرام  
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام  
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام  
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام  
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام  
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام؟  
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام!  
ہیں مہر و مہر و زہرہ و بہرام  
نامِ شاہشہرہ بلند مقام  
مظہر ذوالجلال والا کرام

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام  
نئے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں  
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے  
کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس  
اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد  
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار  
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے  
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ  
کون ہے، جس کے در پہ ناصیہ سا  
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن  
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ



نو بہارِ حدیقہ اسلام  
جس کا ہر قول، معنی الہام  
رزم میں استادِ رستم و سام  
اے ترا عہدِ فرخی فرجام  
لوحش اللہ! عارفانہ کلام  
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام  
ایرج و تور و خسرو و بہرام  
گیو و گودرز و بیژن و رُہام  
آفریں، آب داری صمصام!  
تیغ کو تیری، تیغِ خصمِ نیام

شہسوارِ طریقہ انصاف  
جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز  
بزم میں میزبانِ قیصر و جم  
اے ترا لطف، زندگی افزا  
چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ  
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم  
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے  
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے  
مرحبا، ہوشگانی ناوک!  
تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف

ق

برق کو دے رہا ہے کیا الزام  
تیرے رخسِ سبکِ عنان کا خرام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند  
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا

ق

گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام  
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام  
صفحہ ہائے لیالی و ایام  
مُجملِ مندرج ہوئے احکام  
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

فنی صورتگری میں تیرا گرز  
اُس کے مضروب کے سروتن سے  
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے  
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا  
لکھ دیا شاہدوں کو عاشقِ کُش



آسماں کو کہا گیا کہ کہیں  
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں  
آتش و آب و باد و خاک نے لی  
مہرِ رخشاں کا نام، خسرو روز  
تیری توقعِ سلطنت کو بھی  
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم  
ہے ازل سے ردائی آغاز

گنبدِ تیز گرد، نیلی قام  
خال کو دانہ اور زُلف کو دام  
وضعِ سوز و غم و رم و آرام  
ماہِ تاباں کا اسم، شمعِ شام  
دی بدستور صورتِ ارقام  
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام  
ہو ابد تک رسائی انجام

### قصیدہ

صبحِ دم دروازہ خاور کھلا  
خسروِ انجم کے آیا صرف میں  
وہ بھی تھی اک سیما کی سی نمود  
ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ  
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو  
صبح آیا جانبِ مشرق نظر  
تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر  
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے  
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ  
تاجِ زریں، مہرِ تاباں سے سوا  
شاہِ روشن دل بہادر شہہ کہ ہے

مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا  
شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا  
صبح کو رازِ ہر و اختر کھلا  
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا  
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا  
اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا  
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا  
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا  
کعبہٴ امن و امان کا در کھلا  
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا  
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا



مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا  
عقدہ احکامِ پیغمبر کھلا  
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا  
واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں  
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے  
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام  
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے

### قطعہ

تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا  
تو کہے، بختانہ آزر کھلا  
منصبِ مہر و مہمہ و محور کھلا  
میری حدِ وسع سے باہر کھلا  
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا؟  
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا  
لوگ جانیں طبلہٴ عنبر کھلا

تو سنِ شہہ میں وہ خوبی ہے کہ جب  
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب  
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے  
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک  
تھا دل وابستہ قفلِ بے کلید  
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار  
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس

### غزل

کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا!  
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا  
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا  
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا  
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا!  
رہروی میں پردہ رہبر کھلا

گنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا  
ہم پکاریں اور گھلے یوں کون جائے؟  
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ  
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ  
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں!  
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ!



سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک! آگ بھڑکی منہ اگر دم بھر کھلا  
 نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا  
 دیکھو، غالب سے گر اُلجھا کوئی!  
 ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر، ہوا مدحت طرازی کا خیال خامہ سے پائی، طبیعت نے، مدد  
 مدح سے ممدوع کی دیکھی شکوہ میر کا نپا، چرخ چکر کھا گیا  
 بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب سکہ شہ کا ہوا ہے روشناس  
 شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے  
 ہو سکے کیا مدح، ہاں اک نام ہے فکر اچھی، پرستایش ناتمام  
 جانتا ہوں ہے خط لوحِ ازل تم پہ اے خاقانِ نام آور! کھلا

تم کرو صاحبِ قرانی، جب تک  
 ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا



## مثنوی در صفِ انبہ

ہاں دل درد مند زمزمہ ساز  
خامہ کا صفحے پر رواں ہونا  
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؟  
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے  
آدم کا کون مردِ میداں ہے؟  
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں!  
آم کے آگے پیش جاوے خاک  
نہ چلا جب کسی طرح مقدور  
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے  
مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے!  
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار  
اور دوڑائیے قیاس کہاں!  
جان میں ہوتی مگر یہ شیرینی  
کیوں نہ کھولے درِ خزنہ راز!  
شاخ گل کا ہے گلکشاں ہونا  
نکتہ ہائے خرد فرا لکھیے  
خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے  
شمر و شاخ، گوے چوگاں ہے  
آئے، یہ گوئے اور یہ میداں  
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک  
بادۂ ناب بن گیا انگور  
شرم سے پانی پانی ہونا ہے  
آم کے آگے عیشکر کیا ہے  
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار  
جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!  
کوہکن باوجود غمگینی

ق

جان دینے میں اس کو یکتا جان  
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ شمر  
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان  
کہ دواخانہ ازل میں مگر



آتش گل پہ قند کا ہے قوام  
 پا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے  
 انگبہ کے بحکم ربّ الناس  
 یا لگا کر خضر نے شاخ نبات  
 شب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل  
 تھا ثرنج زر ایک خسرو پاس  
 آم کو دیکھتا، اگر اک بار  
 رونق کارگاہِ برگ و نوا  
 رہو راہِ خلد کا توشہ  
 صاحبِ شاخِ برگ و بار ہے آم  
 خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو  
 وہ کہ ہے والی ولایتِ عہد  
 فخر دین عزّ شان و جاہِ جلال  
 کار فرمائے دین و دولت و بخت  
 سایہ اُس کا، ہما کا سایہ ہے  
 اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور  
 اِس خداوندِ بندہ پرور کو

شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام  
 باغبانوں نے باغِ جنت ہے  
 بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس  
 مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات  
 ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل  
 رنگ کا زرد، پر کہاں بُوِ باس  
 پھینک دیتا طلاے دست افشار  
 نازشِ دودمانِ آب و ہوا  
 طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ  
 ناز پروردہ بہار ہے، آم  
 نویدِ نخلِ باغِ سلطان ہو  
 عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد  
 زینتِ طینت و جمالِ کمال  
 چہرہ آراے تاج و مسند و تخت  
 خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے  
 جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور  
 وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھو

اور غالب پہ مہرباں رکھو



## قطعات



اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر!  
 اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل!  
 پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ  
 فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکیل  
 تیرا اندازِ سخنِ شائے زلفِ الہام  
 تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل  
 تجھ سے عالم پہ گھلا، رابطہٴ قربِ کلیم  
 تجھ سے دنیا میں بچا ماندہٴ بذلِ خلیل  
 بہ سخن، اوجِ درجہٴ مرتبہٴ معنی و لفظ  
 بہ کرم داغِ نہ ناصیہٴ قلزم و نیل  
 تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر  
 تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل  
 ماہِ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر  
 زہرہ نے ترک کیا خوت سے کرنا تحویل



تیری دانش، مری اصلاح مفاسد کی رہن  
 تیری بخشش، مری انجام مقاصد کی کفیل  
 تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید  
 تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل  
 سختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں  
 چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل  
 پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتہ اوقات میں گانٹھ  
 پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناحن تدبیر میں کیل  
 تپشِ دل، نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم  
 کششِ دم، نہیں بے ضابطہ جرِ ثقیل  
 دُور معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی  
 غم گیتی سے مرا سینہ، عمر کی زنبیل  
 فکرِ میری، گہر اندوز اشارتِ کثیر  
 کلکِ میری، رقمِ آموئے عباراتِ قلیل  
 میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح  
 میرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل  
 نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف  
 جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل  
 قبلہ کون و مکاں! بختہ نوازی میں یہ دیر!  
 کعبہ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!



### قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری  
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے  
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ  
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے؟

### قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!  
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہاے ہاے!  
وہ بہر زار ہاے مطرا کہ ہے غضب  
وہ نازنین بجان خود آرا کہ ہاے ہاے  
صبر آزا وہ اُن کی نگاہیں کہ خف نظر!  
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہاے ہاے  
وہ میوہ ہاے تازہ شیریں کہ واہ واہ  
وہ بادہ ہاے ناب گوارا کہ ہاے ہاے!



## در مدحِ ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی  
 زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے  
 خامہ انگشت بدنداں کہ اے کیا کہیے!  
 ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے!  
 مہر مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے  
 حرزِ بازوے شکرِ فانِ خود آرا کہیے  
 مستیِ آلودہ سر انگشتِ حسناں لکھیے  
 داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے  
 خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھیے  
 سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے  
 اخترِ سونہ قیس سے نسبت دیجئے  
 خالِ مشکینِ رخِ دلکش لیلہ کہیے  
 حجرِ الاسودِ دیوارِ حرم کیجئے فرض  
 نافہ آہوے بیابانِ حقن کا کہیے



وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاقی  
 رنگ میں سبزہ نوخیز مسیا کہیے  
 صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز  
 مید کے میں اسے نشتِ خم صہبا کہیے  
 کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟  
 کیوں اسے نقطہٴ پے کارِ تمنا کہیے؟  
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے؟  
 کیوں اسے مردِ مکِ دیدہٴ عنقا کہیے؟  
 کیوں اسے ٹکڑے پیراہنِ لیلیا لکھیے؟  
 کیوں اسے نقشِ پے ناقہٴ سلما کہیے  
 بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض  
 اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

### قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے  
 مجھے جو بھیجی ہے بین کی روغنی روٹی  
 نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ حُلد سے باہر  
 جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بینِ روٹی



## بیانِ مصطفیٰ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی  
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سبہ گری  
کچھ شاعری، ذریعہ عزت نہیں مجھے

آزادہ رد ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ گل  
ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں  
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال  
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر  
سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے



میں کون، اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا  
جو انبساطِ خاطرِ حیرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہ امثالِ امر  
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات  
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ  
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری تھی، پہ طبیعت بُری نہیں  
ہے شکر کی جگہ کہ، شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبِ خدا گواہ  
کہتا ہوں سچ کہ، جھوٹ کی عادت نہیں مجھے



## مدح

نصرتِ الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے  
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے  
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ، گرجی میں کبھی غور کروں  
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سر دست  
نسبتِ اکِ گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے تو سنِ دولت کی عنایاں!  
یہ دُعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا  
گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زہار  
غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے





ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو  
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مُشکِ یو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست  
سبزے کو روندتا پھرنے پھولوں کو جائے پھاند

غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ  
بھاتی نہیں ہے اب مجھ کوئی نوشت خواند

بٹے ہیں سونے روپے کے جھلنے حضور میں  
ہے جن کے آگے سیم و زریہ مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے  
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند



## در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہاں گیرِ جہاں بخشِ جہاندار!  
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدہ دُشوار کہ کوشش سے نہ واہو  
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر!  
گر لب کو نہ دے چشمِ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا  
ہے فخر سلیمان جو کزے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الہی  
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت



تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں  
تو آگ سے گر دفع کرے، تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجہ دریا میں روانی  
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل  
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختمِ دُعا پر  
قاصر ہے ستایش میں تری، میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں  
نظارگی صنعتِ حقِ الٰہی بصارت

تجھ کو شرفِ مہر بہا مقابِ مبارک  
غالب کو ترے عہدِ عالی کی زیارت



## قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو  
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے  
جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو  
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

## گزارشِ مصطفیٰ بحضورِ شاہ

اے جہاندارِ آفتاب آثار!	اے شہنشاہِ آسمان اورنگ!
تھامیں اک دردِ مندِ نینہ فگار	تھامیں اک بے نوائے گوشہ نشین
ہوئی میری وہ گرمی بازار	تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
روشناسِ ثوابت و سیر	کہ ہوا مجھ سا ذرہ نا چیز
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار	گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار	کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
بادشہ کا غلامِ کار گزار	شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
تھا ہمیشہ سے یہ عریفہ نگار	خانہ زاد اور مرید اور مداح
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار	بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
مددِ عائنے ضروری الاظہار	نہ کہوں آپ سے تو کسی سے کہوں



پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں  
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر  
کیوں نہ در کار ہو مجھ پوشش  
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال  
رات کو آگ اور دن کو دھوپ  
آگ تاپے کہاں تلک انساں!  
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی  
میری تنخواہ جو مقرر ہے  
رسم ہے مردے کی چھماہی ایک  
مجھ کو دیکھو تو ہوں بھیدِ حیات  
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض  
میری تنخواہ میں تہائی کا  
آج مجھ سا نہیں زمانے میں  
رزم کی داستان گر سنیے  
بزم کا التزام گر کیجئے  
ظلم ہے، گرنہ دو سخن کی داد  
آپ کا بندہ اور پھروں نکا!  
میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ  
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام  
تم سلامت رہو ہزار برس

ذوقِ آرایشِ سر و دستار  
تانہ دے بادِ زمہریرِ آزار  
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار  
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار  
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!  
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!  
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ  
اُس کے ملنے کا ہے عجب نہجار  
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار  
اور چھما ہی ہو سال میں دوبار  
اور رہتی ہے سود کی تکرار  
ہو گیا ہے شریکِ ساہوکار  
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار  
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار  
ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار  
قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار  
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار!  
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار  
شاعری سے نہیں مجھے سروکار  
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار





یہ کلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے  
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے  
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے  
کہ جو شریک ہوا میرا، شریک غالب ہے



سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی  
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر دن ہوئے  
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد  
تین مسہل، تین تمہریں یہ سب گئے دن ہوئے؟



جستہ انجمن طوے میرزا جعفر  
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی مخلوط  
ہوئی ہے ایسے ہی فرختہ سال میں غالب!  
نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی ”مخلوط“





ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی  
 ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید  
 کہا غالبؔ سے تاریخِ اس کی کیا ہے؟  
 تو بولا ”انشرحِ جنِ جمشید“

۱۲۷۰ھ



گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں  
 دربارِ دارِ لوگ بہم آشنا نہیں  
 کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام  
 اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں



## رباعیات



بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال  
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال  
آہِ پہنچے ہیں تا سواہِ اقلیمِ عدم  
اے عمرِ گزشتہ! یک قدمِ استقبال



شبِ زلف و رُخِ عرقِ فشاں کا غم تھا  
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا  
رویا میں ہزار آنکھ سے صبحِ تنگ  
ہر قطرہ اشک، دیدہ پر غم تھا





آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال  
ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال  
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی  
لڑکوں کے لئے گیا ہے کھیل نکال!



دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی  
بیٹابی رشک و حسرت دید سہی  
ہم اور فردن، اے تجلی، افسوس!  
تکرارِ ردا نہیں، تو تجدید سہی



ہے خلقِ حسدِ قماش لڑنے کے لئے  
وحشتِ کدہ تلاش لڑنے کے لئے  
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد  
ملنے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے





دل سخت بربند ہو گیا ہے گویا  
 اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا  
 پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں  
 غالب! منہ بند ہو گیا ہے گویا



دُکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالب!  
 دل رُک رُک کے بند ہو گیا ہے غالب!  
 واللہ کے شب کو نیند آتی ہی نہیں  
 سونا سو گند ہو گیا ہے غالب!



مشکل ہے زبں کلام میرا! اے دل!  
 سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کابل  
 آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش  
 کویم مشکل، مگر نہ کویم مشکل!





بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ حجابہ نے دال  
 ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال  
 یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال  
 ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال



ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم  
 آثارِ جلالی و جمالی باہم  
 ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم!  
 ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم



حق، شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے  
 تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے  
 یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ  
 ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے





اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا!  
 اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!  
 ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں  
 ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!



کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں  
 عشاق کی پریش سے اُسے عار نہیں  
 جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا  
 کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے  
 کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے  
 کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ!  
 وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے





سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟  
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟  
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن  
نہ خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں!



ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے!  
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہہ والا نے  
کن کر دیوینگے ہم دُعائیں سو بار  
فیروزے کی تسبیح کے، ہیں یہ دانے



## ضمیمہ



دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک  
 وضع میں گو ہوئی دوسر، تیج ہے ذوالفقار ایک  
 ہم سخن اور ہم زباں، حضرت قاسم و طہال  
 ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک  
 نقد سخن کے واسطے، ایک عیار آگہی  
 شعر کے فن کے واسطے، مایہ اعتبار ایک  
 ایک وفا و مہر میں، تازگی بساط دہر  
 لطف و کرم کے باب میں، زینت روزگار ایک  
 گلکدہ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بو  
 ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک  
 مملکت کمال میں، ایک امیر نامور  
 عرصہ قیل و قال میں، خسرو نامدار ایک

قاسم: اس سے ابوالقاسم خان قاسم مراد ہیں۔

طہال: مرزا احمد بیگ طہال مراد ہیں۔

ان دونوں سے ملکتہ کے سفر کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔



گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں  
 مے کدہ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک  
 زندہ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن  
 کشتہٴ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک  
 دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا  
 ایک محبتِ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک  
 جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار  
 فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک  
 لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شامیہٴ ریا سے دور  
 کر کے دل و زبان کو غالبِ خاکسار ایک

الناظر (لکھنؤ) دسمبر ۱۹۳۳ء؛ متفرقات غالب: ۱۰۶.۱.۵





اپنا احوالِ دل زار، کہوں یا نہ کہوں!  
 ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں!  
 نہیں کرنے کا میں تقریر، ادب سے باہر  
 میں بھی ہوں واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں!  
 شکوہ سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو  
 اپن ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں!  
 اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاری سے دل  
 جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں؟  
 دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمن جانی اپنا  
 ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟  
 میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غماز  
 گوش ہیں درپس دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟  
 آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدا!  
 حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں؟

۱: محرم، ۲: شکر جو سمجھو اسے یا کوئی روایت سمجھو، ۳: عزاداری،

۴: میرا۔ ۵: گلدستہ نازنیناں، ص ۲۱۳؛ دیوانِ معروف ۱۶۱-۱۶۲

(متن ”دیوانِ معروف“ سے لیا گیا ہے اور اختلافات ”گلدستہ نازنیناں“

مؤلفہ مولوی کریم الدین (مطبوعہ ۱۸۲۵) پر مبنی ہیں۔





ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں  
 میں دشتِ غم میں، آہوے صیادِ دیدہ ہوں  
 ہوں درد مند، جبر ہو یا اختیار ہو  
 گہہ نالہ کشیدہ، گہہ اشک چکیدہ ہوں  
 جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن  
 از بسکہ، تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں  
 تے سچہ سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ لے  
 میں معرضِ مثال میں، دستِ بُریدہ ہوں  
 ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ  
 نیل داندہ فادہ ہوں، نیل دام چیدہ ہوں  
 جو چاہیے، نہیں وہ مری قدر و منزلت  
 میں یوسفِ بقیعتِ اول خریدہ ہوں  
 ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ  
 ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں  
 اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل  
 پر عاصیوں کے فرقہ میں، میں برگزیدہ ہوں  
 پانی سے سگ گزیدہ ڈر سے جس طرح اسد!  
 ڈرتا ہوں آئینے سے، کہ مر دم گزیدہ ہوں کے

لے واسطہ لے نے، لے چاہتے، لے حلقے، لے زمرے، لے آئینہ  
 لے ہماض علام الدین احمد خاں طلائی (قلمی) (رضالاہیری رامپور)۔





مجلس شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں  
شمع ساں میں تہ دامنِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ، رشتہ گوہر ہر گام  
جس گذر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو  
کہ بہ یک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

۱: عمدۂ تنقید (قلمی) ۹۲





ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ  
 کہ بن گیا ہے خمِ جعد پر شکن تکیہ  
 ہوا ہے دستہ نسرین و نسترِ تن تکیہ  
 جو زحمتِ خواب ہے، پرویں تو ہے پُرِ تن تکیہ  
 رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیمِ تن تکیہ  
 اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ  
 اگرچہ زانوے نل پر رکھے دمن تکیہ  
 کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ  
 رکھو نہ شمع پر اے اہلِ انجمن تکیہ  
 اٹھائے کیونکہ یہ رنجور خستہ تن تکیہ  
 ہوئی ہے اُس کو مری نعلش بے کفن تکیہ  
 کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا، ہے من تکیہ  
 اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن، ”سخن تکیہ“

شب وصال میں، مونس گیا ہے بن تکیہ  
 خراجِ بادشہ چیس سے کیوں نہ مانگوں آج!  
 بنا ہے تختہ و گل ہائے یاسمیں بستر  
 فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام  
 مزا ملے، کہو کیا خاک، ساتھ سونے کا  
 اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر  
 ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب  
 بضرِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا  
 یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک  
 اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن  
 غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو  
 شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا  
 روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ ”تکیہ کلام“

ہم اور تم، ”فلک پیر“ جس کو کہتے ہیں

فقیرِ غالب مسکین کا ہے کہن تکیہ





میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی  
 تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی  
 غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ!  
 ہیں ہوں پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی  
 تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟  
 تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی  
 حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی  
 آپ کا شیوہ و انداز و ادا، اور سہی  
 تیرے کوچہ کا ہے مائلِ دلِ مضطر میرا  
 کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی  
 کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!  
 خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی  
 کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!  
 سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی  
 مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں  
 زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی  
 مجھ سے، غالب! یہ علائی نے غزل لکھوائی  
 ایک بیداد گر رنجِ فزا اور سہی





کٹے تو شب کہیں، کالے تو سانپ کہلاوے  
کوئی بتاؤ، کہ وہ زلفِ خمِ بخم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالع مولود  
کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟

نہ خشر و نشر کا قاتل نہ کیش و ملت کا  
خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے، ہدم  
وگر نہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟





آپ نے مَسْنِیَ الضُّرِّ، کہا ہے تو سہی  
یہ بھی یا حضرت ایوبؑ، گلا ہے تو سہی

رنجِ طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سر  
ذہن میں، خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت، کہ بامید گزر جائے گی عمر  
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری  
نہ سہی، ایک تمنا ہے دوا ہے تو سہی

غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نبھائی اُس نے!  
نہ سہی ہم سے، پے اُس بُت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال میں، میں  
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالب!  
شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی





لطفِ نظارہ قاتل، دمِ بسمل آئے  
جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ، کشی پہ مری کیا گزری!  
دوست جو ساتھ مرے تائب ساحل آئے

وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ!  
ساتھ محتاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں  
”لو، وہ برہم زن ہنگامہ محفل آئے“

دیدہ خونبار ہے مدت سے، ولے آج ندیم!  
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا، حور و پری نے، نہ کیا ہے، نہ کریں  
عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا، غالب!  
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے



○

دیکھ وہ برقِ تبسم بسکہ دل بیتاب ہے  
 دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے  
 کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش  
 ”اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے“

○

ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے  
 رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے  
 پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدا!  
 ہر رات شمعِ شام سے لے تا سحر جلے

○

ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرے ستم نکلے  
 جو وہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے، تو دم نکلے



## خمسہ بر غزل

بہادر شاہ ظفر

گھستے گھستے پانوں میں زنجیر آدھی رہ گئی  
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی  
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی  
”کھنچ کے قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی  
غم سے، جان عاشق دلگیر، آدھی رہ گئی“

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پرِ غم، اُس کے روبرو  
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے روبرو  
بات کرنے میں، نکلتا ہے دم اُس کے روبرو  
”کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو  
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقدیر آدھی رہ گئی“

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار!  
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار!  
مسل زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار



”کھینچتا تھا‘ رات کو، میں خواب میں، تصویرِ یار  
جاگ اُٹھا، جو کھینچنی تصویرِ آدمی رہ گئی“

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز!  
مستی چشمِ یہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز  
تو صدائے پا سے جاگا تھا جو، محو خوابِ ناز!  
”دیکھتے ہی، اے ستمگر! تیری چشمِ نیم باز  
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیرِ آدمی رہ گئی“

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو سکی پر التفات!  
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک اَدنا ہے بات  
ماہِ نو نکلے پہ گذری ہوئی راتیں پان سات  
”اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات  
تابشِ خورشید پر تنویرِ آدمی رہ گئی“

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں  
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں  
جز غم و رنج و اَلَم، گھاٹا ہے ہر ایک بات میں  
”کم نصیبی اس کو کہتے ہیں، کہ میرے ہات میں  
آتے ہی، خاصیت، اکیرِ آدمی رہ گئی“



سب سے یہ گوشہ کنار ہے، گلے لگ جا مرے  
 آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جا مرے  
 سرے گر چادر اُتارے ہے، گلے لگ جا مرے  
 ”مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے  
 وصل کی شب، اے بُت بے پیر آدھی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے  
 پر نصیب اپنا، انہیں جاتا سنا، جوں پھر گئے  
 دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے  
 ”آگے آدھی دور میرے گھر سے، وہ کیوں پھر گئے؟  
 کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟“

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو یارب! کب کی تاب  
 کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات  
 کس لئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پرسوں شب کی بات!  
 ”نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات  
 خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی“



ہو تجلی برق کی صورت میں ہے یہ بھی غضب  
ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصت عیش و طرب  
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب  
”پاس میرے وہ جو آئے بھی“ تو بعد از نصف شب  
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر! آدھی رہ گئی“

تم جو فرماتے ہو، دیکھ، اے غالب آشفہ سرا!  
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے کیا کیوں اُس کے گھر؟  
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر  
”دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر  
وہاں کے جانے میں مری تو قیر آدھی رہ گئی“



## قصیدہ

ملا ذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سیاہ  
 جنابِ عالی ایلن بردن والا جاہ  
 بلند رُتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر  
 کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ نگاہ  
 وہ محض رحمت و رافت، کہ بہر اہل جہاں  
 نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ  
 وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پُرسش کی  
 بنے ہے، شعلہٴ آتش، اشیںِ مَدّہٴ کاہ  
 زمیں سے سُدّہٴ گوہر اُٹھے، بجائے غبار  
 جہاں ہو تو سنِ حشمت کا اُس کے جولا نگاہ  
 وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں: ”الہی، شکر“  
 وہ خشمگین ہو، تو گردوں کہے: ”خدا کی پناہ“



## ق

یہ اُس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش  
 کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ  
 ہر بڑ، پنچے سے، لیتا ہے کام شانے کا  
 کبھی جو ہوتی ہے اُبھی ہوئی دُمِ روباہ  
 نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم  
 نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسر شاہ  
 خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند  
 ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ  
 زہے، ستارہ روشن، کہ جو اُسے دیکھے  
 شعاعِ مہر درخشاں ہو، اُس کا تارِ نگاہ  
 خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں  
 پینگا شرق سے تاغرب اس کا بزیگاہ  
 جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی  
 کہ تابع اس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ  
 کہے گی خلق اسے ”داورِ سپہر شکوہ“  
 لکھیں گے لوگ اسے ”خبر و ستارہ سیا“  
 عطا کرے گا خداوندِ کار ساز اسے  
 روانِ روشن و خوں خوش و دل آشگاہ



ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں، کہ اسے  
 پڑے نہ قطعِ خصومت میں، احتیاجِ گواہ  
 یہ ٹر کتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس  
 یہ لے گا، بادِ شہِ چیں سے، چھینِ تخت و گلاہ  
 سننِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھاون  
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ  
 یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں  
 دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ  
 اُمیدوارِ عنایات، ”شیوہ نارائن“  
 کہ آپ کا ہے نمکِ خوار اور دولتِ خواہ  
 یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عز و جاہ کے ساتھ  
 تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!



## قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ  
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروز شمار  
یقین جان، برس گانٹھ کا ہے جوتا گا  
گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے!  
دکھا کے رشتہ کسی جوتی سے پوچھا تھا  
کہا، کہ ”چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نوگر ہیں  
خود آسمان ہے مہاراو راجا پر صدقے  
وہ راو راجہ بہادر کہ حکم سے جن کے  
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے سال بسال  
انہیں کی سالگرہ کے لئے بناتا ہے  
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے یہ توقیر  
سُن اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے  
پے دُعاے بقاے جناب فیض مآب  
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی  
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو

ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ  
ہوا کر گئی ہر اک سال پیش کار گرہ  
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بیس بار گرہ  
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ  
کہ ”دیکھ کتنی اٹھالائے گا یہ تار گرہ؟“  
جو یاں گینگے تو پاویں گے نو ہزار گرہ  
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر شمار گرہ  
رواں ہو تار پہ فی الفور دانہ وار گرہ  
کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار گرہ  
ہوا میں بوند کو ابر مگرگ بار گرہ  
کہ بن گئے ہیں شمر ہائے شاخسار گرہ  
تجھے بتاؤں، کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ  
لگے گی اس میں ثوابت کی استوار گرہ  
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ  
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ



کشاہدہ رُخ نہ پھرے کیوں جب اُس زمانے میں  
 متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا  
 خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہِ سخن  
 کہاں مجالِ سخن، سانس لے نہیں سکتا  
 گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات  
 کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے  
 ادھر نہ ہو گی توجہ حضور کی جب تک  
 دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں ازرہِ بغض  
 بچے نہ از پے بند نقاب یارِ گرہ  
 کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطارِ گرہ  
 کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسارِ گرہ  
 پڑی ہے دل میں مرے غم کی پیچدارِ گرہ  
 زباں تک آ کے ہوئی اور اُستوارِ گرہ  
 بُری طرح سے ہوئی اور اُستوارِ گرہ  
 کبھی کسی سے کھلے گی نہ زینہارِ گرہ  
 پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکارِ گرہ

دل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بشکل پھوڑے کی

خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھارِ گر



## قصیدہ

فرماں رواے کشورِ پنجاب کو سلام  
نوابِ مستطاب، امیرِ شہِ احتشام  
تُرکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لینِ حُسام  
واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام  
دل نے کہا، کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام  
حضرت کا عِز و جاہ رہے گا علی الدوام  
دریائے نور ہے فلکِ آبِ گینہِ فام  
حق کے تَفَعُّلات سے ہو مرجِ اناہ  
تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ، تلخ کام  
کاتب کی آستیں ہے، مگر تیغ بے نیام  
جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام  
لبس رہا، نہ نذر نہ خلعت کا انتظام  
جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام  
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام  
لبس ملا نشست میں از روئے اہتمام

کرتا ہے چرخِ روزِ بھد گونہ احترام  
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس  
جمِ رتبہ میکلُوڈ بہادر کہ وقتِ رزم  
جس بزم میں کہ ہوا نہیں، آئینِ میکشی  
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چارودہ کہوں  
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا  
سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے  
میری سنو، کہ آج تم اس سر زمین پر  
اخبارِ لودھیانہ میں، میری نظر پڑی  
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر  
وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا  
سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم  
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز  
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں  
اس بزمِ پُر فروغ میں، اس تیرہ بخت کو



سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل  
عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بنا  
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر  
آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب  
اس کش مکش میں آپ کا مذاہج درد مند  
جو داں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو  
ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں  
و کٹوریہ کا دہر میں جو مدح خوان ہو  
خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور  
امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال  
ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو  
دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے

دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام  
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام  
اُس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام  
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اثر دہام  
آقا سے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام  
دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام  
سلطانِ بحر کے درکا ہوں میں غلام  
شاہانِ عصر چاہیے لیں عزت اس سے دام  
بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام  
بارے قدیم قاعدے کا چاہیے قیام  
چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام  
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دُعا، کہ زیرِ رنگیں آپ کے رہے

اقلیمِ ہند و ہند سے تا ملکِ روم و شام



## قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں  
 شب و روز، افتخارِ لیل و نہار  
 گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز  
 سو اس اکیس دن میں ہولی کی  
 شہر میں گویو، عمیر و گلال  
 شہر، گویا، نمونہ گلزار  
 تین تیوہار، اور ایسے خوب  
 پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں  
 محفلِ غسلِ صحتِ نواب  
 بزمگاہ میں، امیر شاہ نشاں  
 پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ  
 جن کی مسند کا آسمان گوشہ  
 جن کی دیوارِ قصر کے نیچے  
 دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور  
 انجمنیں چرخ، گوہر آگیں فرش  
 راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے  
 وہ نظر گاہِ اہل وہم و خیال  
 واں کہا یہ عطا و بدل وہ کرم!  
 عیدِ شوال و ماہِ فرورِ دیں  
 مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں  
 لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں  
 جا بجا مجلسیں ہوئی رنگیں  
 باغ میں سو سو، گل و نرسیں  
 باغ، گویا، نگار خانہ چیں  
 جمع ہر گز ہوئے نہ ہونگے کہیں  
 منعقد، محفلِ نشاطِ قریں  
 رونق افزائے مسدِ تمکین  
 رزمگاہ میں، حریف شیر سکیں  
 خیر خواہ جناب، دولت و دیں  
 جن کی خاتم کا آفتابِ نکسین  
 آسمان ہے گدائے سایہ نشین  
 نہ ہوئی ہو کبھی بروے زمیں  
 نورِ ہے، ماہِ ساغرِ سمیں  
 ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں  
 یہ ضیا بخش چشمِ اہل یقین  
 کہ جہاں گد یہ گر کا نام نہیں



یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے  
نغمہِ مطربانِ زہرہ نوا  
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون  
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار  
سب نے جانا، کہ ہے پری تو سن  
نقشِ سُمِ سمند سے ہکسیر  
فوج کی گردِ راہ، مُشک فشاں  
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت  
مَوکبِ خاص یوں زمیں پر تھا  
ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ شمس  
جلوۂ کولیانِ ماہِ جبیں  
یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت میں  
بکمالِ تجمل و تزیین  
اور بالِ پری ہے دامنِ زیں  
بن گیا دشت، دامنِ گلچیں  
رہروں کے مشام، عطر آگیں  
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں  
جس طرح ہے سپہر پر پروں

## ق

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام  
اور داغِ آپ کی غلامی کا  
بندہ پرور! ثنا طرازی ہے  
آپ کی مدح، اور میرا منہ!  
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے  
پیری و نیستی، خدا کی پناہ!  
صرف اظہار ہے، ارادت کا  
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے  
ہے دعا بھی یہی، کہ دنیا میں  
تم رہو زندہ جاوداں! آمیں!

ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں  
خاص بہرام کا ہے زیبِ سُرِیں  
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں  
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں!  
ہو گیا ہوں زار و زار و حزیں  
دستِ خالی و خاطرِ غمگین  
ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں  
غالب عاجِ نیاز آگیں



## مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگ کاغذی  
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا  
میں کہا: ”اے دل! ہوائے دلبراں  
”بیچ میں اُن کے نہ آنا زنیہار  
”گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر  
”اب تو مل جائے گی تیری اُن سے ساتھ  
”سخت مشکل ہو گا، سلجھانا تجھے  
”یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے  
”ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں  
دل نے سُن کر، کانپ کر کھا بیچ و تاب

لے کے دل، سرِ رشتہ آزادی  
اِس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا  
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں  
یہ نہیں رہیں گے رُسو کے یارِ غار  
کھینچ لیتی ہیں یہ ڈورے ڈال کر  
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ  
تھر ہے دل ان میں الجھانا، تجھے  
بھول مت اِس پر اڑاتے ہیں تجھے  
مُفت میں ناحق گٹا دیں گے تمہیں  
غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردِ نم آگندہ دوست

می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست



## قطعات

### قطعه

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطِ خاک! رہا ہے زور سے ابر ستارہ بار برس  
کہاں ہے ساتھی مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر؟ بیار، لا، مے گلنار گوں؛ بہار برس  
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی درِ حضور پڑا ہے ابر! بار بار برس  
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے ”امیرِ کلپ علی خاں جبیں ہزار برس“  
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس  
جنابِ قبلہ حاجات! اس بلا کش نے بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بدِ غم سے نجات

خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو سازگار برس



## قطعہ

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں  
 حیدر آباد دکن، رشک گلستانِ ارم  
 رام پور، اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر  
 کہ جہاں بہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم  
 حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ  
 اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم  
 رام پور آج ہے وہ بقعہ معمور، کہ ہے  
 مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم  
 رام پور، ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال  
 دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم  
 جس طرح باغ میں سانوں کی گھنائیں برسیں  
 ہے اُسی طور پر یہاں وجلہ فشاں دستِ کرم  
 ابر دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام



دُرِ شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم  
 صبح دم باغم میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں  
 سبزہ و ہیک گل و لالہ پہ دیکھے شبنم  
 کجدا باغ ہمایون تقدس آثار!  
 کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم  
 مسلکِ شرح کئے ہیں راہرو و را شناس  
 خضر بھی یہاں اگر آجائے، تولے ان کے قدم  
 مدح کے بعد دُعا چاہیے، اور اہلِ سخن  
 اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم  
 حق سے کیا مانگیے، اُن کے لیے جب ہو موجود  
 مُلک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم  
 ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل  
 دو دُعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم  
 یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے  
 دو وہ چیزیں، کہ طلبگار ہے جن کا عالم  
 اولاً عمرِ طبعی، بہ دوامِ اقبال  
 ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم



## قطعہ تاریخ اختتام کتاب

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں  
تمام دہر میں اس کے مطلب کا چرچا ہے  
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش  
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے  
عجیب نسخہٴ نادر لکھا ہے اک اس نے  
نہیں کتاب ہے اک منبع نکاتِ بدیع  
کل اس کتاب کے سال تمام میں جو مجھے  
حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام  
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام  
ہوئی ہے میدِ عالم سے اس قدر انعام  
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام  
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام  
نہیں کتاب ہے اک معدنِ جواہر کام  
کمالِ فکر میں دیکھا، غر دے بے آرام

کہا یہ جلد، کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے  
”لکھا ہے نسخہٴ تحفہ“ یہی ہے سالِ تمام



اے جہان آفریں، خدائے کرم!  
نام میکوؤ جن کا ہے مشہور  
صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم  
یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور  
عمر و دولت سے شادمان رہیں  
اور غالب پہ مہربان رہیں



## قطعہ

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم  
عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی  
سویہ نظر فروز قلمدان نذر ہے  
مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

## سہرا

خوش ہو، اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا  
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا  
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!  
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا  
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ گلاہ!  
مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے تیرا لمبر سہرا  
ناؤ بھر کر ہی پردے گئے ہونگے موتی  
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا  
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی  
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا  
رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا  
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا



یہ بھی اک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے  
 رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا  
 جی میں اترائیں نہ موتی، کہ ہمیں ہیں اک چیز  
 چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر، سہرا  
 جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے  
 گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا!  
 رُخ روشن کی دمک، گوہر غلطاں کی چمک  
 کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر، سہرا  
 تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابر بہار  
 لائے گا تابِ گراں باری گوہر، سہرا  
 ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں  
 دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

### سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں  
 بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا  
 ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو  
 ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا



## سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا  
چاند کا دائرہ لے، ڈہرہ نے گایا سہرا  
رشتک سے لڑتی ہیں، آپس میں الجھ کر لڑیاں  
باندھنے کے لئے جب سر یہ اٹھایا سہرا

## قطعہ تاریخ

اس کتاب طرب نصاب تے جب  
فکر تاریخ سال میں، مجھ کو  
ہند سے پہلے سات سات کے دو  
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا  
سال ہجری تو ہو گیا معلوم  
مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو  
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ  
غرض اس سے ہیں چارودہ معصوم  
اور بارہ امام ہیں بارہ  
اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے  
جو ائمہ کے ہیں تولائی



## خط منظوم بنام علانی

بس کہ فعال مایسریں دے آج ہر سلحشور انگلستان کا  
 گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا  
 چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا  
 شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنہ خوں ہے، ہر مسلمان کا  
 کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا  
 میں نے مانا، کہ مل گئے، پھر کیا؟ وہی رونا تن و دل و جاں کا  
 گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزش داغباے پنہاں کا  
 گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دید ہاے گریاں کا  
 اس طرح کے وصال سے، یارب!  
 کیا مٹے داغ و دل سے ہجراں کا

## خط منظوم بنام علانی

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے ہمیں بادۂ تاب اور آم کھائیں  
 سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم کہ دتی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں  
 سوا ناج کے جو ہے مطلوب جاں نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں  
 ہوا حکم باور چیوں کو، کہ ہاں! ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں  
 وہ کھٹے کہاں پائیں اٹلی کی پھول وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں  
 فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار  
 کہو، اس کو کیا کھا کے ہم خط اٹھائیں



## قطرہ

اے منشی خیرہ سرا! سخن ساز نہ ہو      عصفور ہے تو، مقابل باز نہ ہو  
آواز تری نکلی، اور آواز کے ساتھ      لاٹھی وہ لگی، کہ جس میں آواز نہ ہو

## قطرہ

کیا، ان دنوں بسر ہو، ہماری فراغ میں      کچھ تفرقہ رہا، نہ دل و درد و داغ میں  
چاہا پشیم شوق، جو موسیٰ نے طور پر      یہاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں  
یہ ملک و وقار، علائی! یہ حشتیں      شورش ہے کچھ ضرور، تمہارے دماغ میں

## مرثیہ

ہاں، اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو      اے وجلہ خوں! چشم ملائک سے رواں ہو  
اے زمزمہ قم! لب عیسیٰ پہ نغاں ہو      اے ماتمیانِ شہِ معصوم! کہاں ہو  
بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی      اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی  
تاب سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو      ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو  
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو      گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو  
یہ خرگہ نہ جو مدت سے بجا ہے      کیا خیمہ شہر سے رتبہ میں سوا ہے!



کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا  
کیسا فلک اور مہر جہان تاب کہاں کا!  
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا  
ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا  
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے  
گرتا نہیں اس رُوسے کہو برق نہیں ہے

### سلام

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو  
نہ بادشاہ نہ سٹلاں یہ کیا ستالیش ہے  
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟  
خدا کا بندہ، خداوند گار بندوں کا  
فروغ جوہر اماں، حسینؑ ابن علیؑ  
کفیل بخشش امت ہے بن نہیں پڑتی  
مسیحؑ جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی  
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل  
عدو کی سمع رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات  
بہت ہے پایہ گردِ رہ حسینؑ بلند  
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرہ خاک  
ہمارے درد کی یارب! کہیں دوا نہ ملے  
ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حُسن مہر کو دادا

تو پھر کہیں کہ پھر اس سے سوا کہیں اُس کو  
کہو، کہ خامس آلِ عبا کہیں اُس کو  
کہو، کہ رہبر راہِ خدا کہیں اُس کو  
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟  
کہ شمع انجمنِ کبریا کہیں اُس کو  
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو  
ستم ہے کشتہ تیغِ جفا کہیں اُس کو  
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو  
کہ دینِ دُنا و ملکِ سب بجا کہیں اُس کو  
بقدرِ فہم ہے، مگر کیا کہیں اُس کو  
کہ نوکِ جوہر تیغِ قضا کہیں اُس کو  
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو  
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اُس کو



زمامِ ناقہ کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقین  
وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرساے  
امامِ وقت کی یہ قدرت ہے کہ اہلِ عناد  
یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں  
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ  
علیؑ کے بعد حسنؑ کے بعد حسینؑ  
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے  
رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو

بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد  
غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

### رباعیات

رُقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے  
حاجی کُلو کو دے کے بیوجہ جواب  
ثاقب! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے  
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں!  
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟  
کٹتا ہے بتاؤ، کس طرح سے رخصاں؟  
سُنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے صداوت گہری  
دہری کیونکر ہو جو کہ ہودے صوفی؟  
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری  
شیعی کیونکر ہو، ماوراء النہری؟



## فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ لے حاصل  
بادہ، غالب! غرقِ بید نہیں



ابر روتا ہے، کہ بزمِ طرب آمادہ کرو  
برق ہنستی ہے، کہ فرصت کوئی دم ہے، ہم کو



بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر  
کہ چشمِ تر میں، ہر اک پارہٴ دل، پائے درگل ہے



دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سو آپ کا  
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال دے



شمشیرِ صاف یار، جو زہراب دادہ ہو  
وہ خطِ سبز ہے، کہ بہ رخسارِ سادہ ہو



دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو      آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

ہستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے      یہ رنگِ زرد ہے، چمنِ زعفران مجھے

جگر سے ٹوٹے ہوئے سو کی ہے سناں پیدا      دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق، خرمنِ سوزِ اسبابِ ہوس بہتر

جو ہو جاوے ثنایِ برق، مشیتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ! غلط      کی تصور نے بہ صحراے ہوس راہ غلط

ماہِ نو ہوں کہ فلکِ عجز سکھاتا ہے مجھے      عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلالتا ہے مجھے

صبا! لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی      کہ رُوئے غنچہ گل سوئے آشیاں پھر جائے



زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے  
ایسے ہستے کوڑ لایا ہے کہ جی جانے ہے

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا!  
مذہب نہیں ہے کوئی، ملت نہیں ہے کوئی

گلشِ دہر بھی، ہے کوئی سراے ماتم  
شبِ نیم اس باغ میں جب آئے، تو گریاں آئے

دورنگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب  
کہ مزدوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

پھر مرتبہ بڑھایا مرا، نفی غیر نے  
آیا ہر ایک مکانِ نظر، لامکاں مجھے

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تانک کی  
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر  
روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا  
آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

دمِ واپسین برسرِ راہ ہے  
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے



## نسخہ حمیدیہ

تنگی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا      میرا سفر بہ طالع چشمِ حسود تھا  
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر      کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا  
خُورِ شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدا!      سر تا قدم، گزارشِ ذوقِ سجود تھا

ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدم یا رب!      ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا  
بے دماغِ خجلت ہوں رشکِ امتحاں تاگے      ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا  
خاکبازی اُمید، کار خانہ طفلی      یاس کو دو عالم سے، لب بخندہ وا پایا

شبِ نظارہ پرور تھا، خواب میں خیال اُس کا      صبح، موجہِ گل کو نقشِ بویا پایا

کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا      میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا  
ساغرِ جلوہ سرشار ہے ہر ذرہ خاک      شوقِ دیدار، بلا آئینہ ساماں نکلا  
کچھ کھلتا تھا مرے سینہ میں، لیکن آخر      جس کو دل کہتے تھے سوتیر کا پیکاں نکلا  
وسعتِ رحمت حق دیکھ کہ بخشا جاوے      مجھ سا کافر، کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا



دیدہ تادل ہے، یک آئینہ چراغاں، کس نے  
مطرب دل نے، مرے تارِ نفس سے غالب!  
خلوتِ ناز پہ پیرایہ محفل باندھا؟  
ساز پر رشتہ پرے نغمہ بیدل باندھا

واں، ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدا!  
ناخنِ غم، یاں، سرِ تارِ نفس مضرب تھا

اگر آسودگی ہے مدعاے رنجِ بیتابی  
نثارِ گردشِ پیانہ مے، روزگار اپنا

ہو اے صبح یک عالمِ گریباں چاکِ گل ہے  
دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

اسدا! یہ عجز و بے سامانی فرعون تو ام ہے  
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعویٰ ہے خدائی کا

ہم نے وحشتِ کدہ بزمِ جہاں میں جوں شمع  
شعلہٴ عشق کو اپنا سروِ سامان سمجھا





نگاہِ چشمِ حاسدِ وام لے اے ذوقِ خود بینی! تماشا ئی ہوں وحدتِ خانہ آئینہ دل کا  
شرِ فرصتِ نگہِ سامانِ یک عالم چراغاں ہے بقدرِ رنگِ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا  
سراسر تاختن کو، شش جہت یک عرصہ جولاں تھا ہوا و اماندگی سے رہرواں کی فرق منزل کا  
مجھے راہِ خن میں خوفِ گمراہی، نہیں، غالب!  
عصاے خضرِ صحراے خن ہے خامہ بیدل کا



بصورتِ تکلف، بمعنی تاتف اسد! میں تبسم ہوں پڑ مردگاں کا



ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش، در بھی دور تھا اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا  
اے واے! غفلتِ نگہ، شوقِ ورنہ یاں ہر پارہ سنگِ لختِ دل کوہِ طور تھا  
درسِ تپش ہے برقِ کوابِ اس کے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا  
جست ہے تیری تیج کے کشتوں کی، منتظر جوہرِ سوادِ جلوہ مرثگانِ خور تھا

ہر رنگ میں جلا، اسدِ فتنہ انتظار  
پروانہ تجلی شمعِ ظہور تھا



خود پرستی سے رہے باہم دگر، نا آشنا  
 آتش موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک  
 بید ماغی شکوہ سنج رشکِ ہم دیگر نہیں  
 ربطِ یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار

بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا  
 ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا! آشنا  
 یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا  
 سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ گل نا آشنا

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو، پر اسدا!  
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بُت پرستی ہے بہارِ نقشِ بندی ہائے دہر  
 کل اسد کو ہم نے دیکھا، گوشہٴ غم خانہ میں

ہر صریرِ خامہ میں یک نالہِ ناقوس تھا  
 دستِ برسر، سر بہ زانوئے دلِ مایوس تھا

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوقِ فنا، ورنہ  
 اشارتِ فہم کو، ہر ناخنِ بزدیدہ، ابرو تھا





بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبِ ہا  
سرِ تارِ نظر ہے رشتہٴ تسبیح کو کب ہا

کرے گر، فکرِ تعمیرِ خرابی ہاے دل، گردوں  
نہ نکلے خشتِ مثلِ استخوان، بیرونِ قالب ہا

کرے ہے، حسنِ خواہاں، پردہ میں مشاطگی اپنی  
کہ ہے تہِ بندیِ خط، سبزہٴ خط در تہِ لب ہا

اسد کو بُت پرستی سے غرض دردِ آشنائی ہے  
نہاں ہیں نالہٴ ناقوس میں در پردہ ”یارب ہا“



بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت، اہتمامِ اُس کا  
نگین میں، جوں شرارِ سنگ، ناپیدا ہے نامِ اُس کا  
بہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں، محملِ کشِ حسرت  
مبادا ہو عنانِ کبرِ تغافل، لطفِ عامِ اُس کا  
اسد! سوداے سرسبزی سے، ہے تسلیمِ رنگین تر  
کہ کشتِ خشکِ اُس کا، ابر بے پروا خرامِ اُس کا

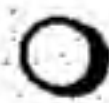




عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا      ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا  
آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا      دل دیوانہ، کہ وارستہ ہر مذہب تھا  
شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ، غالب!  
ہم میں سرمایہٴ ایجادِ تمنا کب تھا



یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا      آغوشِ نقشِ پا میں کیجئے فشارِ صحرا  
وحشت اگر رسا ہے، بجا صلی ادا ہے      پیانہ ہوا ہے، مشتِ غبارِ صحرا  
دیوانگی اسد کی، حسرت کشِ طرب ہے  
درِ سرِ ہوائے گلشن، درِ دلِ غبارِ صحرا



وحشی بن، صیاد نے ہم رُخوردوں کو کیا رام کیا  
رشتہٴ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا  
مہر بجائے نامہ لگائی، بر لبِ پیکِ نامہ رساں  
قاتلِ تمکینِ سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا  
شامِ فراقِ پار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدا  
ماہ کو، درِ تسبیح کو اکب، جائے نشینِ امام کیا





سیر آنسوئے تماشا ہے طلبگاروں کا      خضرِ مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا  
 پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے!      رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا  
 اسد، اے ہرزہ درا! نالہ بہ غوغا تا چند؟  
 حوصلہ تنگ نہ کر، بے سبب آزاروں کا



بوقتِ کعبہ جوئی ہا، جس کرتا ہے ناقوسی  
 کہ صحرا، فصلِ گل میں، رشک ہے بت خانہ چیں کا  
 اسد! اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں  
 سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسین کا



وردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا      رشتہٴ تسبیح، تارِ جادہٴ منزل ہوا  
 عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندیِ اسد!      نقص پر اپنے ہوا جو مطلع، کامل ہوا



سر منزل ہستی سے ہے صحراے طلبِ دور      جو خط ہے کفِ پایہ سو ہے سلسلہٴ پا





قطع سفر ہستی و آرام فنا ہے      رفتار نہیں، بیشتر از لغزش پا ہے  
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی      ہستی نہیں جو بستنِ بیان وفا ہے  
کس بات پہ مغرور ہے؟ اے عجز تمنا!      سامانِ دعا وحشت و تاثیر دعا ہے  
آہنگِ اسد میں نہیں جو نغمہ بیدل  
”عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہے“



زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسد!  
غفلتِ آرامی یاراں پہ ہیں خنداں، گل و صبح



تھی نگہ میری نہاںخانہ دل کی نقاب  
تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیارہ  
بے خبر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد  
مُتفرق ہوئے میرے رفقا، میرے بعد

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی  
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہاںِ داد  
تیغِ درکف، کفِ بلب، آتا ہے قاتل اس طرف  
مُردہ باد، اے آرزوے مرگِ غالب! مُردہ باد

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند  
رکھتا ہے انتظارِ تماشاے حُسنِ دوست  
قربانِ اوجِ ریزی چشمِ حیا پرست  
ہے دلبری، کمینِ گرِ ایجادِ یک نگاہ  
اے طفلِ خود معاملہ! قد سے عصا بلند  
مژگانِ باز ماندہ سے دستِ دعا بلند  
یک آسماں ہے مرتبہ پشتِ پا بلند  
کارِ بہانہ بھولی چشمِ حیا بلند



چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ  
 بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گلِ تاچند  
 بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پر رنگ  
 شمع و گلِ تاکِ و پروانہ و بلبلِ تاچند  
 سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا  
 ناکسی! آئینہ نازِ توکلِ تاچند  
 اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالمِ اوہام  
 مشکلِ آساں کن یک خلق! تغافلِ تاچند

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ  
 برنگِ نئے ہے نہاں در ہر استخوانِ فریاد  
 تغافلِ آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے  
 ہوئی ہے محو، بہ تقریبِ امتحاں فریاد  
 ہلاکِ پیغمبری، نعمتِ وجود و عدم  
 جہانِ و اہلِ جہاں سے، جہاں جہاں فریاد  
 جوابِ سنگدلیِ ہائے دشمنانِ ہمت  
 ز دستِ شیشہِ دلہائے دوستاں فریاد  
 ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد  
 خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد



○

رگِ گلِ جادۂ تا رنگہ سے حد موافق ہے  
 ملیں گے منزلِ اُلفت میں ہم اور عندلیبِ آخر  
 غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بیقراری ہے  
 نیازِ بالِ افشانی ہوا صبر و شکیبِ آخر  
 اسد کی طرح، میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں  
 ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب! آخر

○

ظلم کرنا، گدائے عاشق پر نہیں شاہانِ حُسن کا دستور  
 دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے دشمنی ہے، وصال کا مذکور  
 زندگانی پہ اعتماد، غلط ہے کہاں قصیر؟ اور کہاں فغفور؟  
 کیجئے، بھوں اشک، اور قطرہ زنی  
 اے اسد! ہے ہنوز دلی دور

○

اے چرخ! خاکِ بر سرِ تعمیرِ کائنات      لیکن بنائے عہدِ وفا، استوار تر





تیز تر ہوتا ہے خشم مند خویاں عجز ہے  
 ہے رگِ سنگِ فسان تیغِ شعلہ خار و خس  
 سختی راہِ محبت، منعِ دخلِ غیر ہے  
 تیغ و تابِ جادہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عس  
 اے اسد! خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں  
 ظاہراً صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس



کفر ہے، غیر از و فورِ شوق، رہبرِ خواست  
 راہِ صحراے حرم میں، ہے جرس، ناقوس و بس  
 یک جہاں گل، تخیلِ مشقِ شگفتن ہے، اسد!  
 غنیہ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس



اے آرزو شہید وفا! خوبیاں نہ مانگ  
 برہم ہے برمِ غنیہ، بہ یک جنبشِ نشاط  
 میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں  
 نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفسِ دگر  
 مجھ بہر دست و بازوے قاتلِ دعانہ مانگ  
 کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل! ہوانہ مانگ  
 دشمن سمجھ، ولے نگہ آشنا نہ مانگ  
 آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنائہ مانگ





بقدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے      وگر نہ خانہ آئینہ کی فضا معلوم  
بہارِ درگرو غنچہ شہرِ جولاں ہے      طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم  
طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا      بمرگ، تکیہ آسائشِ فنا معلوم  
اسد، فریقہ انتخاب طرزِ جفا  
وگر نہ دلبری وعدہ وفا معلوم



فرطِ پنجواہی سے ہیں شبہائے بجرِ یار میں      جوں زبانِ شمع، داغِ گرمی افسانہ ہم  
جانتے ہیں جوشِ سوداے زلفِ یار میں      سنبُلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم  
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے      چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم



از آنجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم      رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم  
تماشائے گلشنِ تمنائے چیدن      بہارِ آفرینا! گنہگار ہیں ہم  
نہ ذوقِ گریباں، نہ پرواے داماں      نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم  
اسد! شکوہ کفر و دعا نا سپاسی  
ہجومِ تمنائے لاچار ہیں ہم



غالب! ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے ہے عجز بندگی، جو علیؑ کو خدا کہوں

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا؟ غالب! جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

جائے کہ پائے سیل بلا درمیاں نہیں دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں

ناگوارا ہے ہمیں احسان صاحب دولتاں ہے زرِ گل بھی، نظر میں جوہرِ فولاد، یاں  
قطرہ ہائے خون بسِ کل زہیپ دامن ہیں اسدا! ہے تماشا کردنی، گل چینی جلاؤ، یاں

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن وقت ہے، گر بلبلی مسکین زلیخائی کرے  
قالبِ گل میں ڈھلی ہے نشستِ دیوارِ چمن یوسفِ گل جلوہ فرما ہے، بہ بازارِ چمن



پھر حلقہ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں  
پایا سر ہر ذرہ، جگر گوشہ وحشت  
دیو و حرم آئینہ تکرارِ تمنا  
جوں دود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں  
ہیں داغ سے معمور، شقائق کی کلاہیں  
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

تمیز زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں  
بہ زاہداں رگ گردن ہے رشتہ زنار  
بہ عکس آئینہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں  
سرے پاپے بٹے نا نہادہ رکھتے ہیں

سوداے عشق سے دمِ سر کشیدہ ہوں  
دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متصل  
کی متصل ستارہ شماری میں عمر صرف  
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشان  
ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج  
دیتا ہوں کشتگان کو، سخن سے سر پیش  
ہے جنبشِ زباں بدہن، سخت ناگوار  
جوں بولے گل، ہوں گرچہ، گراں بارِ مشیت زر  
میں عنایہ گلشنِ نا آفریدہ ہوں  
مضربِ تار رہاے گلوے بریدہ ہوں  
خونابہ بکلاہلِ حسرت چشیدہ ہوں

لیکن، اسدا! بوقتِ گزشتنِ جریدہ ہوں





نہ انشا معنی مضمون، نہ املا صورتِ موزوں  
عنایت نامہائے اہل دنیا ہر زہ عنوان ہیں  
مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے  
وگرنہ، مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں  
اسد! بزمِ تماشا میں، تغافلِ پردہ داری ہے  
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ غریاں ہیں



اے نوا سازِ تماشا! سربکف جلتا ہوں میں  
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں  
ہے تماشا گاہ سوزِ تازہ، ہر یک عضو تن  
جوں چراغانِ دِوالی صفِ بصف جلتا ہوں میں  
شمع ہوں، تو بزم میں جاپاؤں غالب کی طرح  
بے محل، اے مجلسِ آزادے نجف! جلتا ہوں میں



فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں      برنگِ جاوہ، سرکوسے یار رکھتے ہیں  
جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب!      بسانِ دشتِ ولی، پر غبار رکھتے ہیں



○  
 ہو سکے کب، گلفتِ دل، مانعِ طوفانِ اشک!  
 گردِ ساحل، سنگِ راہ جو شیشِ دریا نہیں  
 ہے طلسمِ دہر میں، صد شرِ پاداشِ عمل  
 آگہی، غافل! کہ یکِ امروز بے فردا نہیں  
 بسمل اس تیغِ دو دستی کا نہیٹے بچا، اسدا!  
 عافیتِ بیزار! شغلِ کعبتین اچھا نہیں

○  
 ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت  
 عزتِ آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں  
 کب تلک پھرے اسدا لہائے نفثہ پر زباں  
 طاقتِ لبِ تشنگی، اے ساقی کوثر نہیں

○  
 زلفِ خیال نازک و اظہارِ بیقرار - یارب! بیانِ شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

○  
 ہم زانوئے تامل و ہم جلوہ گاہِ گل آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ  
 دلِ کارِ گاہِ فکر و اسدا بنو اے دل یاں سنگِ آستانہ بیدل ہے آئینہ





ہر داغِ تازہ یکِ دلِ داغِ انتظار ہے  
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل  
عرضِ فضاے سینہ دردِ امتحاں نہ پوچھ  
”دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ“  
اے کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے، کہ آہ



خلق ہے صفحہٴ عبرت سے سبقِ ناخواندہ  
میکدے میں زدلِ افسردگی بادہ کشاں  
خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفتہ و بیاں  
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے  
ورنہ ہے چرخِ وز میں یکِ ورقِ گردانندہ  
موجِ مے، مثلِ خطِ جام ہے برجاماندہ  
کہ سخنِ گردِ زدِ امانِ ضمیر افشانندہ  
ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ  
حیف بیجا صلی اہلِ ریا پر، غالب!  
یعنی ہیں ماندہ ز آں سودِ ازیں سورانندہ



کی ہے وا اہلِ جہاں نے بگلستانِ جہاں  
یاسِ آئینہٴ پیدائی استغنا ہے  
چشمِ غفلت نظرِ شبنمِ خورِ نادیدہ  
ناامیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ  
واسطے فکرِ مضامینِ متین کے، غالب!  
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرا میدہ



شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و اُمید کا سمجھ  
وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں  
گاہ بخلد اُمید وار، کہ بہ ججیم بیمناک  
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنہ سعی امتحان

خانہ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ  
رشتہ عمرِ خضر کو نالہ نارسا سمجھ  
گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفتِ ماسوا کچھ  
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آن، غفلتِ مدعا سمجھ  
جلوہ نہیں ہے دردِ سرِ آئینہ صندلی نہ کر  
ہے خطِ عجزِ ما و تو، اولِ درسِ آرزو  
شیشہ شکستِ اعتبارِ رنگِ بگردش استوار  
نغمہ ہے محو سازِ رہ، نقشہ ہے بے نیازِ رہ  
نے سروِ برگِ آرزو نے رہ و رسم گفتگو

شوق کرے جو سرگراں، محملِ خوابِ پا سمجھ  
عکس گجا و گونہ نظر، نقش کو مدعا سمجھ  
ہے یہ سیاقِ گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا سمجھ  
گر نہ مٹیں یہ کوہِ سازِ آپ کو تو صدا سمجھ  
رند تمام نازِ رہ، خلق کو پارِ سا سمجھ  
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمہ، یا علی! مدد  
ٹوٹے گز آئینہ اسدا! سُجھ کو خوں بہا سمجھ

مستی فریبِ نامہِ راجِ سراب ہے      یک عمر نازِ شوخی عنوان اٹھائیے





کیا پوچھے ہے بر خرد غلطی ہائے عزیزاں      خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے  
گو تم کو رضا جوئی اغیار ہے، لیکن      جانتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے!  
مت پوچھ اسد! وعدہ کم فرصتی زیت  
دودن بھی جو کاٹے، تو قیامت بعتوں سے



مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے  
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دُوں! وہ بھی



کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بیوفائی!  
سر پیٹتے ہیں اپنا؟ ہم اور نیک نامی  
ہر چند عمر گزری آزر دگی ہیں، لیکن  
ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ ناتمامی  
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت  
دریا سے خشک گذرے مستوں کی تہنہ کامی



گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتے اسد!  
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے



کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو اتنا بھی اے فلک زدہ! کیوں بے حواس ہے؟

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے  
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ  
خوشادہ دل! کہ سراپاِ طلسمِ پیجری ہو  
چمن میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟  
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی  
کہ خارِ خشک کو بھی دعوایِ چمنِ نسبی ہے  
لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے  
جنون و یاس و الم، رزقِ مدعا طلبی ہے  
کہ برگِ برگِ سمن، شیشہ ریزہ جلی ہے  
علیؑ ولیٰ اسد اللہ، جانشینِ نبی ہے

بے چشمِ دل، نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

تاچند پست فطرتی طبعِ آرزو؟  
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے  
یارب! ملے بلندی دستِ دعا مجھے  
اے جوشِ عشق! بادۂ مردِ آزما مجھے



○  
کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی!  
کہ شمع خانہ دل آتشِ مے سے فروزاں کی  
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی  
ولیکن کیا کروں، آوے جو رسوائی گریباں کی

○  
وہ دیکھ کے حُسن اپنا، مغرور ہوا غالب!  
صد جلوہ آئینہ یک صبح جدائی ہے

○  
ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدا!  
لا لاق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

○  
اسدا! جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر  
دو عالم آگہی، سامانِ یک خواب پریشاں ہے

○  
عاشق نقابِ جلوہ جانا نہ چاہیے  
ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش  
فانوسِ شمع کو پر پروانہ چاہیے  
پیاں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے





وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسدا!  
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے



ہوا شرم تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر  
بس اے زخمِ جگر! اب دیکھ لی شورشِ نمکداں کی  
بیادِ گرمی صحبت، برنگِ شعلہ، دہکے ہے  
چھپاؤں کیونکہ غالب! سوزشیں داغِ نمایاں کی



باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے      کر دیا ہے پابہ زنجیرِ رمِ آہو، مجھے



عروجِ نشہ ہے سر تا قدم، قدِ چمنِ رُویاں  
بجائے خود، وگرنہ، سرد بھی میناے خالی ہے  
یہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے  
زمینِ جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے  
اسدا! اٹھنا قیامتِ قامتوں کا، وقتِ آرائش  
لباسِ نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے



○  
 ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بخودی  
 خوابِ نازِ گلِ رُخاں، دُودِ چراغِ کشتہ ہے

○  
 آتشِ افروزیِ یکِ شعلہِ ایما تجھ سے  
 اے اسد! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم  
 چشمکِ آریں صد شہرِ چراغاں مجھ سے  
 کاش! ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

○  
 بسکہ ویرانی سے گُرو دیں ہوئے زیرِ وزیر  
 اے سرِ شوریدہ! نازِ عشق و پاسِ آبرو  
 گردِ صحراے حرم تا کوچہ زُتار ہے  
 یک طرفِ سودا و یک سو منتِ دستار ہے!

○  
 بہ سختی ہائے قیدِ زندگی، معلومِ آزادی  
 شرورِ بندِ دامِ رشتہ رگہائے خارا ہے

○  
 بذوقِ شوخی اعطاءِ تکلفِ بارِ بستر ہے  
 مصافحہِ پیچ و تابِ کشمکشِ ہر تارِ بستر ہے  
 مژہ فرسِ رہ و دل ناتوان و آرزو مضطر  
 پپائے خفتہ، سیرِ وادیِ بدخارِ بستر ہے



ہو سکے کیا خاک، دست و بازوے فرہاد سے  
پستوں، خوابِ گرانِ خسرو پرویز ہے

ترجیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے  
شوق ہے مثلِ حباب از خویش پیروں آمدن  
موج گردابِ حیا ہے، چینِ پیشانی مجھے  
ہے گریباں گیرِ فرصت ذوقِ عریانی مجھے

شوی طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر  
دردِ ناپیدا و بے جا تہمتِ وارستگی  
نامہ اعمال ہے تاریکی کو کب مجھے  
پردہ دارِ یادگی ہے وسعتِ مشرب مجھے

اسد! بہارِ تماشاے گلستانِ حیات  
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

غم و عشرتِ قدمبوسِ دل تسلیم آئیں ہے  
دعاے مدعا گم کردگانِ عشق ”آمین“ ہے  
پیامِ تعزیت پیدا ہے، اندازِ عیادت سے  
شبِ ماتم، تیرِ دامانِ دودِ شمعِ بالیں ہے



بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدا دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

عبرت طلب ہے حلِ معماے آگہی شبنم گدازِ آئینہ اعتبار ہے  
خلجت کش وفا کو، شکایت نہ چاہیے اے مدعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے

کیا ہے ترکِ دنیا، کاہلی سے ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے  
پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے  
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر پھر ہم در بدر، ناقابلی سے

جنوں افسردہ و باں ناتواں، اے جلوہ! شوخی کر۔  
گئی یک عمرِ خودداری، بہ استقبالِ رعنائی  
نگاہِ عبرتِ افسوں، گاہِ برق و گاہِ مشعل ہے  
ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی



ریشک ہے، آسائشِ اربابِ غفلت پر آسہ  
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطر آگاہ ہے

نے حسرتِ تسلی، نہ ذوقِ بیکراری  
حضرت چلے حرمِ کُواب آپ کا خدا ہے  
یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے  
بچانے میں آسہ بھی بندہ تھا، گاہ گاہ ہے

خانمانِ جبریاں غفلت معنی خراب  
جب ہوئے ہم بے گناہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟  
چاہے گر جہت، جز آدم وارثِ آدم نہیں  
شوخی ایمانِ زاہد، سُستی تدبیر ہے  
آب ہو جاتے ہیں، تنگِ ہمتِ باطل سے مرد  
اشک پیدا کر، آسہ! گر آہ بے تاثیر ہے

یقین ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو  
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سببِ کائے





خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے  
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو  
زبان سے عرض تمناے خامشی معلوم  
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے  
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں، کہ تو جانے  
مگر وہ خانہ برانداز ”گفتگو“ جانے



بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب! تو پھر  
کیوں نہ دلی میں، ہر اک ناچیز نوابی کرے



صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے  
غافلاں! آغازِ کار، آئینہ انجام ہے



اے خوشاوقے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے  
تار و پودِ فرشِ محفل، پنبہ مینا کرے  
توڑ بیٹھے، جب کہ ہم جام و سنو، پھر ہم کو کیا  
آسماں سے بادۂ گلفام، گو برسا کرے



○  
 بہ رہن ضبط ہے، آئینہ بندی گوہر      وگر نہ بحر میں ہر قرہ چشم پر نم ہے  
 اگر نہ ہووے رگِ خواب صرف شیرازہ      تمام دفتر ربطِ مزاج، برہم ہے  
 اسدا! بہ ناز کی طبعِ آرزو، انصاف  
 کہ ایک وہم ضعیف و غمِ دو عالم ہے

○  
 کشودِ غنچہ دلہا عجب نہ رکھ، غافل!  
 اسدا! جہاں کہ علیٰ برسرِ نوازش ہو  
 صبا خرامیِ خواباں، بہارِ ساماں ہے  
 کشادِ عقدہٗ دشوار، کارِ آساں ہے

○  
 دامگاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں!  
 پرِ فشانِ بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے  
 اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مہشانی نہ مانگ  
 جوں پرِ طاؤس، چندیں داغ، مُشکِ اندودہ ہے  
 کیاں کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش!  
 عافیت، سرمایہٗ بال و پرِ نکشودہ ہے  
 جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے  
 مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدمِ پیودہ ہے  
 پتہٗ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں  
 مے پرستاں! ناصحِ بیصرف گو، بیہودہ ہے





کچھ نہیں حاصل تعلق میں، بغیر از کشمکش  
اے خوشا رندے! کہ مرغ گلشن تجرید ہے  
کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسد  
یا علی! وقت عنایات و دم تائید ہے



شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ و گویاے ثبات؟  
گل صد شعلہ، بیک جیبِ شکیبائی ہے  
بوے گل، فتنہ بیدار و چمن، جامہ خواب  
وصل بر رنگِ تپش، رسوتِ رسوائی ہے



نوائے خفتہ اُلفت اگر بیتاب ہو جاوے  
پر پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے  
بہ رنگِ گل، اگر شیرازہ بند بیخودی رہے  
ہزار آشفگی مجموعہ یک خواب ہو جاوے  
اسد! باوصفِ عجز بے تکلف خاک گردیدن  
غضب ہے گر غبارِ خاطر احباب ہو جاوے



تاچند، نازِ مسجد و بُخّانہ کھینچے      چوں شمع، دلِ بخلوتِ جانا نہ کھینچے  
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر      دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچے  
ہے ذوقِ گر یہ عزمِ سفر کیجئے اسدا!  
رختِ جنونِ سیل بہ دیرانہ کھینچے

دامانِ دل بو ہم تماشا نہ کھینچے      اے مدّعی! خجالتِ بیجا نہ کھینچے  
گلِ سرسبز، اشارۂ جیبِ دریدہ ہے      نازِ بہار، جُز بہ تقاضا نہ کھینچے  
حیرت، حجابِ جلوہ و وحشتِ غبارِ راہ      پائے نظر بد امنِ صحرا نہ کھینچے  
داماندگی، بہانہ و دہشتگی، فریب      دردِ طلب بہ آبلہ پا نہ کھینچے  
خود نامہ بن کے جائیے، اُس آشنا کے پاس  
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچے

جامِ ہر ذرّہ، ہے سرشارِ تمنا مجھ سے      کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے  
جوشِ فریاد سے لونگادیتِ خوابِ اسدا!      شوخیِ نغمہ، بیدل نے جگایا ہے مجھے





دل آگاہ، تسکین خیز بیدردی نہ ہو یارب!  
خدا یا! چشم تا دل درد ہے افسون آگاہی  
نفس آئینہ دار آہ بے تاثیر بہتر ہے  
نگہ حیرت سوادِ خواب بے تعبیر بہتر ہے  
بتاں! نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے  
دردن جوہر آئینہ، جوں برگِ جتا، خوں ہے



در یوزہ سامانہا، اے بے سرو سامانی!  
تمثالِ تماشاہا، اقبالِ تمنا ہا  
ایجادِ گریبانہا، در پردہ عریانی  
عجزِ عرقِ شرے، اے آئینہ حیرانی  
پروازِ فنا مشکل، میں عجزِ تن آسانی  
دامِ گلہ اُلفت، زنجیرِ پشیمانی  
خوں ہو قفسِ دل میں اے ذوقِ پر افشانی!  
معدورِ سبکساری، مجبورِ گرانجانی  
گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں  
صدِ نالہ اسدِ بلبل، در بندِ زباندانی



دو جہاں گردشِ یک سیمہ اسرارِ نیاز  
خلوتِ دل میں نہ کر دخل، بجز سجدہ شوق  
نقدِ صد دل، بگریبانِ سحر پہناں ہے  
آستانِ میں صفتِ آئینہ در پہناں ہے



نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی  
 خراب نالہ بلب، شہید خندہ گل  
 ہزار قافلہ آرزو، بیاباں مرگ  
 وداع حوصلہ، توفیق شکوہ، عجز وفا  
 رقیب آئینہ ہے حیرت تماشا  
 ہنوز دعوئے تمکین و بیم رسوائی  
 ہنوز محمل حسرت بہ دوش خودرائی  
 اسدا! ہنوز گمان غرورِ دانائی

گداے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے  
 فردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے  
 بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی سے  
 طراوتِ سحرِ ایجادِ اثر، یکسو  
 چمن چمن گل آئینہ درکنارِ ہوس  
 نیاز، پردہ اظہارِ خود پرستی ہے  
 بہانہ جوئی رحمت، کہیں گر تقریب  
 اسدا! بہ موسمِ گل در طلسمِ گنجِ قفس  
 خرامِ تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے  
 کہ خامشی کو ہے پیرایہِ بیاں تجھ سے  
 چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے  
 حناے پائے اجلِ خونِ کشتگاں، تجھ سے  
 بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے  
 اُمیدِ محوِ تماشاے گلستاں تجھ سے  
 جہینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے  
 وفاے جوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے



چار سوے عشق میں صاحبِ دکانی مُفت ہے  
نقد ہے داغِ دل اور آتشِ زبانی مُفت ہے  
چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے  
بر ہو سہاے جہاں دامنِ فشانِی مُفت ہے

اسد! جاں نذرِ الطافے، کہ ہنگامِ ہم آغوشی  
زبانِ ہر سر ہو، حالِ دل پر سیدنی جانے

رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے، غالب!  
یاں زُورِ خود داری طوفانی معنی ہے

خوبصورت اور معیاری کتاب چھوانے کے لئے شعیب مسکن سے رابطہ کیجئے۔

موبائل نمبر: 0300-9231954



# مُکلیاتِ سَاحِرِ لَدِہِیا نوئی



## سَاحِرِ لَدِہِیا

